Ahmad Nadwi

پندرہ روزہ
تعمیر حیات

نئی حکومت کے لئے دانشمندی کا راستہ

حضرات!

انسان کو قدرت کی طرف سے دو بڑی صلاحیتیں بلکہ نعمتیں عطا ہوئی ہیں، ایک سود و زیاں اور نفع و نقصان میں موازنہ کی صلاحیت دوسرے واقعات سے سبق لینے کی قابلیت۔ جہاں تک پہلی صلاحیت کا تعلق ہے اس سے انسانی افراد اور انسانی اداروں نے جن میں تہذیبیں اور حکومتیں دونوں شامل ہیں، بڑا فائدہ اٹھایا ہے اور اس کے ذریعہ وہ بڑے مصائب اور بڑے نقصانات سے بچ گئے ہیں۔ اب ہمارے قائد و رہنما اور ذمہ داران حکومت غور کریں کہ کسی ایک انتہا پسند طبقہ کے اثر یا مطالبہ کی وجہ سے ان مسائل کو معلق رکھنا یا پرانی سیاسی تلخیوں کے نتیجہ میں (جو کسی ناعاقبت اندیش سیاسی جماعت کی غلط روی نے پیدا کر دی تھیں) ان مسائل سے مسلسل آنکھیں بند رکھنا صحیح ہے، جس کے نتیجہ میں ہندوستان کی آبادی کا ایک اہم عنصر اضطراب و اشتباہ کا شکار ہے یاد رہے کہ یہ وہ عنصر ہے جو فطری صلاحیتوں سے مالا مال، قوت عمل، عزم و جذبہ سے بھرپور، مہم جوئی اور خطرات پسندی کی اس صلاحیت سے بہرہ مند ہے، جس سے بڑا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اور جس کی ہمت اور سادہ قلندرانہ جرأت نے اس صورت حال کے تبدیل کرنے میں بڑی مدد کی، جو انیس مہینے قائم رہی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ترکمان دروازہ کا المیہ، مظفر نگر اور سلطان پور کے شہیدوں کا خون نہ ہوتا تو وہ آندھی نہ اٹھتی جو اندرا گورنمنٹ کو اڑا کر لے گئی۔ ایک ایسی اقلیت یا فرقہ کو مسلسل بے چینی اور اضطراب میں مبتلا رکھنا اور اس کی توانائیوں کو ملک و وطن کے استحکام، اور اس کی سربلندی کے کام پر لگنے کے بجائے اپنے مسائل و مطالبات کے پیش کرنے میں مصروف رکھنا دانشمندی اور ملک کے ساتھ خیر خواہی کی بات ہے؟ اس سب کا جواب قومی دھارے کے ساتھ مسلمانوں کے بہنے کا وہ مطالبہ نہیں ہے جو ایک ریکارڈ کی ہوئی آواز کی طرح یا ایک روایتی طوطے کی رٹ کی طرح دہرایا جاتا رہتا ہے، سیاسی کارگاہ اور قوموں کے مسائل کے میدان میں "ون وے ٹریفک" کا اصول نہیں چل سکتا، یہ حقائق کی دنیا ہے اور یہاں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کا معاملہ ہے، اور "جیو اور جینے دو" کا اصول کارفرما ہے۔

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

قیمت عام شمارہ: ۶۰ پیسے

از ہارون رشید صدیقی ناظم مدرسہ ثانویہ

ایک مختصر رپورٹ

۹ رجب دوشنبہ کو مدرسہ ثانویہ کا سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات زیر صدارت جناب مولانا ابوبکر صاحب حسنی ندوی سلیمانیہ ہال میں ہوا، جس میں تجوید، تقریر، مقالہ نگاری، نظم خوانی اور بیت بازی کے مقابلوں میں اوّل، دوم اور سوم آنے والے ۲۶ طلبہ کو انعامات اور سندیں دی گئیں، تقریباً دو سو طلبہ کو کھیل کود کے مقابلوں میں کامیابی حاصل کرنے پر انعامات دئے گئے، اس موقع پر ناظر مدرسہ ثانویہ نے یہ مختصر رپورٹ پیش کی۔

حضرات! مدرسہ ثانویہ کا تعلیمی سال اپنی نوعیت کا انوکھا سال تھا، اس سے قبل نہ تو کبھی اتنا اضافہ رہا نہ طلبہ کی اتنی تعداد، طلبہ کی تعداد سوا دو سو سے بڑھ کر چار سو ہو گئی، شروع سال ہی سے ۱۶ اساتذہ مہیا کئے گئے، سائنس، میتھیمیٹکس اور انگریزی کا معیار بلند کرنے کے لئے چار بی۔ ایس۔ سی اور بی۔ اے، ایم۔ اے اساتذہ مقرر کئے گئے ایک معقول لیبوریٹری کا نظم کیا گیا، طلبہ کی نشستوں کے لئے ٹاٹ کے بجائے میز کرسیوں کا انتظام کیا گیا، یہ تجربہ اس ادارہ کے لئے بالکل نیا تھا لیکن خدا کے فضل سے کامیاب رہا، طلبہ اور اساتذہ دونوں نے دلچسپی لی۔ عربی اور کلام پاک کی تعلیم بہتر بنانے کے لئے ہم نے کوشش کی، ہمارے سامنے مشکلات بھی پیش آئیں لیکن ہم نے ان کا مقابلہ کیا، انگلش ٹیچر جناب معین الدین صاحب ایم۔ اے تعلیم کے دوسرے ہی مہینہ بہت بیمار ہو گئے، چنانچہ دوسرے استاد کا سہارا لینا پڑا۔ ہمارے دو ساتھی ماسٹر سراج احمد صاحب بی۔ ایس۔ سی اور ماسٹر عبد الجبار صاحب بی۔ اے سرکاری ملازمتوں پر چلے گئے اور انکی جگہیں پُر کرنا پڑیں، عربی ٹیچر جناب مولوی عبد الرشید ندوی بی۔ اے ریاض یونیورسٹی چلے گئے، ان کی جگہ بھی دوسرا انتظام کرنا پڑا، ہم اپنے استاد مکرم جناب مولانا نور الحسن صاحب کے ممنون ہیں کہ اس موقع پر انہوں نے ہمارا بھرپور تعاون فرمایا، اگرچہ جو اساتذہ گئے، ان کی جگہیں بہتر اساتذہ سے پُر ہوئیں، لیکن بہر حال ہمارے طلبہ تختۂ مشق بنے رہے جس کا کچھ نہ کچھ نقصان تو اٹھانا ہی پڑا، پھر بھی مدرسہ کا حال خراب نہیں ہوا، ہم نے دوسرے مدارس خصوصاً کئی سرکاری مدارس دیکھے الحمد للہ ڈسپلن، وقت کی پابندی، اور حاضری سب میں بہتر پایا، تعلیم میں تو جو مضامین ہم پڑھاتے ہیں ان میں بہت ہی آگے پایا، اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم کامیاب رہے اور دوسروں نے بھی کیا کہ کامیاب رہے، اور جس حد تک کامیابی نظر آ رہی ہے، اس میں ہمارے رفقاء کی محنتوں، حضرت مہتمم صاحب کی عنایات، دوسرے بزرگان مدرسہ کی توجہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی دامت برکاتہم کی دعاؤں، جناب ماسٹر ریاض الدین صاحب اور جناب مولانا نجم الدین صاحب ندوی کے مشوروں کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔

لیکن دوستو! سچی بات یہ ہے کہ اپنے بزرگوں کے اشارہ پر جو معیار ہم نے خود مقرر کیا ہے، اس اعتبار سے ابھی ہمارا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ادارہ بالکل مشین کی طرح کام کرے، ہمارے کام کے اوقات اور معمولات سے لوگ گھڑیاں ملائیں، ہمارے اشارے پر طلبہ حرکت کریں، تعلیمی اوقات میں پن ڈراپ سائیلنس ہو اگر کہیں آواز ہو تو سوال کرنے والے استاد یا جواب دینے والے طالب علم کی، درجوں میں سنجیدگی، متانت، علم، جستجو، چالاکی، ذہانت اور مصروفیت کے مجسمے نظر آئیں، ہمارے اساتذہ اپنی وسعت معلومات اور تجربات سے طلبہ کو دریائے علم میں غوطہ لگانا سکھا دیں، محنت، مشغولیت، ادب، احترام، سلیقہ ہمارے طلبہ کا شعار ہو، ہمارے طلبہ ہیپیوں کے مقلد نہ ہوں، زن نما مردوں کے پیرو نہ ہوں، سنت رسول ﷺ کے دلدادہ ہوں، وہ بال نہ سنواریں، جسم بنائیں، وہ رنگا رنگ لباسوں کے بجائے نوع بہ نوع علم سے زینت حاصل کریں، دین کی ایک ایک قدر پر وہ جان دیں، ہم نہیں چاہتے کہ وہ چوبیس گھنٹے صوفی بنے رہیں، جس وقت وہ کھیل کے میدان میں اتریں تو کانپور اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کو مات دیں لیکن جب نماز کا وقت آ جائے، اذان کی آواز سنیں تو متانت و سنجیدگی کے ساتھ مسجد میں نظر آئیں، یہ صفات پیدا کرنے کے لئے صرف میری کوششیں کافی نہیں ہو سکتیں، جہاں تک میری محنت کا تعلق ہے تمام ٹیبل پر تو میرے صرف تین گھنٹے نظر آتے ہیں لیکن میں سال بھر آٹھوں گھنٹے مصروف رہا ہوں، سال گزر گیا میں نے صرف تین رخصتیں حاصل کیں

میں نے بارہ بارہ اور سولہ سولہ گھنٹے مدرسہ کا کام کیا ہے لیکن مثل مشہور ہے اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا تاہم میری محنت ضائع نہیں گئی لیکن پوری کامیابی کے لئے ہمارے رفقاء کو ہمارا منشا سمجھنا ہوگا اور پر خلوص تعاون پیش کرنا ہوگا، طلبہ کے سرپرستوں کے تعاون کے بغیر بھی ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دار الاقامہ کے نگراں حضرات کی توجہ بھی ہمارے لئے ضروری ہے، ہم کو یقین ہے کہ ہمارے رفقاء ہماری بات سے اتفاق کرتے ہیں اور وہ اپنے تعاون میں ان شاء اللہ اضافہ فرمائیں گے طلبہ کے سرپرستوں کے تعاون کے لئے ہم کو شروع سال میں ان کی ایک میٹنگ بلانا ہوگی، اگر زندگی نے ساتھ دیا اور اللہ نے چاہا تو ہمارے بزرگوں کی توجہ آئندہ بھی ہمارے شامل حال رہے گی اور ہم اپنے مقرر کردہ خاکہ پر محنت کر کے ایک بہتر نمونہ پیش کر سکیں گے۔

آخر میں ہم اپنے عزیز طلبہ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ کے سامنے آپ کے انعامات کے یہ جو چھوٹے چھوٹے پیکٹ رکھے ہوئے ہیں انہیں ان کو حقیر نہ جانئے گا۔ اصل میں یہ انعام نہیں انعامات کی علامتیں ہیں، آپ کا انعام تو وہ ہے جو ہمارے اور تمہارے دوسرے اساتذہ کے دلوں میں ہے جس نے اس انعام کا فیصلہ کروایا، آپ کا انعام وہ ہے جو آپ کے دل و دماغ میں اتر گیا لہٰذا اس علامتی انعام کو بھی احترام سے لیجئے اور اس کی بھی قدر کیجئے!

ہم تمام شرکاء جلسہ کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمارے طلبہ کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور شکریہ کا موقع عنایت فرمایا، ہم آئندہ بھی ایسی ہی توجہ کے محتاج ہیں، و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

بقیۂ اداریہ

نے ملی سلامتی سے مل کر مخلوط حکومت بنائی، ملی سلامتی نے اپنے شرائط کو منوایا جس میں اہم دستور میں تبدیلی اور دینی آزادی، دینی تعلیمی اداروں کو عصری اداروں کے مساوی مقام وغیرہ تھے، نجم الدین اربکان نائب وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز تھے، عرصہ سے قبرص میں ترک اقلیت پر کئے جانے والے مظالم کا قلع قمع ان کے تدبر اور ملی سلامتی پارٹی کی حمیت کا نتیجہ تھا، ترکی نے پوری جرأت سے یونانیوں کو ظلم سے باز رکھنے کے لئے حملہ کر دیا اور مسلم اقلیت کا محفوظ علاقہ قائم کر دیا۔

یہ مخلوط وزارت اختلافات کا شکار ہوئی تو ملی سلامتی پارٹی نے سلیمان ڈیمرل کی ڈیموکریٹک پارٹی سے اتحاد کیا اور یہ مخلوط حکومت حالیہ انتخابات تک قائم تھی۔

۵ جون ۱۹۷۷ء کے ترکی کے عام انتخابات پر تمام دنیا کی نظریں لگی تھیں، ان انتخابات کو وقت سے پہلے کرایا گیا تھا جسکے پیچھے ملی سلامتی پارٹی کے بڑھتے ہوئے اثر کو ختم کرنے کی زبردست سازش تھی، اس سازش میں بڑی طاقتیں بھی ملوث تھیں، ملی سلامتی پارٹی کی ترکی میں بھاری صنعتوں کو فروغ دینے یورپی مشترکہ منڈی سے ترکی کو علیحدہ کرنے اور اسلامی ممالک کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کرنے کی کامیاب کوشش دیکھ کر لادینی قوتوں نے اسکو ناکام کرنے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، ملی سلامتی کے رہنما نجم الدین اربکان نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کو سات حکومتوں کا جس طرح مقابلہ تھا وہی صورت اس انتخاب میں ہمارے ساتھ پیش آئی تھی کہ ہمارا مقابلہ سات جماعتوں سے تھا، ہر جماعت نے اپنی انتخابی مہم میں ہمیں نشانہ بنایا۔ یہاں تک کہ جمہوریہ ترکی کے صدر فخری کوروتورک نے جو اسلامی شریعت کے مخالف ہیں، انتخابات سے قبل اپنی ایک تقریر میں عوام سے ڈیموکریٹک اور ریپبلکن پارٹی کو منتخب کرنے کو کہا تھا۔

جعلی ووٹ ڈالے گئے، بے دینوں اور کمیونسٹوں نے بھی اسلام کا نام استعمال کیا۔ ان تمام مخالفتوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ ملی سلامتی پارٹی کو صرف ۲۴ نشستیں مل سکیں، لیکن اس کی توازن قوت کی حیثیت برقرار رہی، کوئی پارٹی واضح اکثریت کے ساتھ کامیاب نہیں ہوئی، ریپبلکن پارٹی کے بلند اجوید کو صدر نے حکومت بنانے کی دعوت دی، لیکن یہ حکومت اعتماد کا ووٹ حاصل نہ کر سکی اور اسے مستعفی ہونا پڑا۔ اب پھر ڈیموکریٹک اور ملی سلامتی مخلوط حکومت بن گئی ہے — نجم الدین اربکان نائب وزیر اعظم ہیں، ملی سلامتی کے آٹھ وزراء کابینہ میں ہیں جن کے پاس بعض اہم محکمے ہیں — ترکی کو عرصہ تک لادینیت کی راہ پر لگانیوالے لیڈر اور ان کی جماعتیں اب اسلام کا نام لینے لگی ہیں۔ ملی سلامتی پارٹی کے ممبران پارلیمنٹ کتنے ہیں اور انہیں ووٹ کتنے ملے تنہا یہ دیکھنا کافی نہیں، ان ہمہ گیر دینی اثرات کو دیکھنا چاہئے جس کے لئے ترکی کے عوام نصف صدی سے ترس رہے تھے۔

ترک ۵۰۰ سال تک خلافت اسلامیہ کے امین رہے، اس قوم میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ عالم اسلام کی قیادت کرے، اس کی اسلام کی طرف بازگشت ایک اچھے مستقبل کی علامت ہے، کیا عجب کہ آئندہ صدی اقبال کے اس خواب کی تعبیر بن جائے ؎

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونیوالا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

لکھنؤ

تعمیرِ حیات

ہندو ورزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۱۴ | ۱۰ و ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء — ۲۵ شوال و ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۹۷ھ | شمارہ نمبر ۲۳-۲۴

زرِ خریداری اندرونِ ہند مع محصول ڈاک:
سالانہ ۱۲ روپے ششماہی سات روپے
فی پرچہ ۶۰ پیسے
بیرونِ ہند مع محصول ڈاک
بحری ڈاک سے ایک پاؤنڈ، شلنگ،
ہوائی ڈاک سے ۱۰ امریکن ڈالر
یورپین ممالک: ۳ پونڈ
افریقہ، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کے ممالک ۲ پونڈ
پاکستان: ۳۰ روپے
بنگلہ دیش: ۱۵ روپے

مسلمانوں کے مسائل کو معلق رکھنا یا نظر انداز کرنا صحیح نہیں

اگر ترکمان دروازہ کا المیہ مظفرنگر اور سلطانپور کے شہیدوں کا خون نہ ہوتا تو وہ آندھی نہ اٹھتی جو اندرا گورنمنٹ کو اڑا کر لے گئی

ملی کنونشن میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا افتتاحی خطبہ

۳، ۴ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو دہلی میں مسلمانوں کی جماعتوں، مکاتبِ خیال اور اہم شخصیتوں کی طرف سے ملی کنونشن کا انعقاد ہوا، اس میں جمعیۃ العلماء، جماعت اسلامی، مسلم لیگ اور ملک کی دیگر جماعتوں کی نمائندگی تھی، اس کنونشن کا افتتاح … مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے فرمایا، اپنے افتتاحی خطبہ میں مولانا نے مسلمانوں اور ذمہ داران حکومت دونوں کو صحیح راہِ عمل اور طریقۂ کار اختیار کرنے اور سود و زیاں اور نفع و نقصان کے موازنہ اور حالات سے سبق حاصل کرنے کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا، مولانا کا یہ اہم افتتاحی خطاب یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

نئی دہلی ۳ اکتوبر۔ ملی کنونشن کے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے فرمایا:

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد!

حضرات! میں آپ کی اس عزت افزائی کا دل سے شکر گذار ہوں کہ آپ نے اس اہم "ملی کنونشن" کے افتتاح کی خدمت میرے سپرد کی یہ ایک اعزاز بھی ہے اور ایک بڑی ذمہ داری بھی۔ کنونشن کے داعیوں اور ذمہ داروں کے مقام سے یہ بات بہت فروتر ہے کہ ان کا اس سے مقصد محض ایک رسم و روایت کی پیروی یا ایک ضابطہ کی خانہ پُری ہے۔ اس افتتاح کا کنونشن کے اغراض و مقاصد، داعیوں، بلکہ صحیح تر الفاظ میں ملت کے جذبات و احساسات اور وقت کے حقائق و واقعات سے گہرا تعلق ہے۔ اس میں اگر منزلِ مقصود کا پورا تعین اور اس کی مکمل تصویر نہیں آسکتی (کہ یہ خطبۂ صدارت کا موضوع ہے) تو سمتِ سفر کی نشان دہی اور جرس کارواں کی گونج ضرور سُنائی جانی چاہئے۔

حضرات!

اس ملی کنونشن کے انعقاد پر اس کے داعی یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے وقت کی ایک اہم ضرورت کا احساس کیا۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات و مسائل کا حقیقت پسندانہ اور جرأت مندانہ جائزہ لینے اور ان کے احساسات و جذبات کی صحیح ترجمانی کے لئے دور دور سے آکر جمع ہوئے۔ وہ ایک بار پھر بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ملی و اجتماعی مسائل کیا ہیں۔ وہ کن مسئلوں کو مسلمانوں کی حیاتِ ملی کے لئے رگِ جاں یا شرطِ حیات کی حیثیت دیتے ہیں اور ان کے حل ہوئے بغیر کسی ملک میں بھی (خواہ اس میں وہ اکثریت میں ہوں یا حکومت و اقتدار میں) اپنی زندگی کو محض عبث ہی نہیں بلکہ ایک مسلسل معصیت اور ان حیوانات اور چوپایوں کی زندگی سمجھتے ہیں جن کے لئے محض رات کا انتظام اور صرف جسم و جان کی حفاظت کی ضمانت ہے۔

ملی مسائل کو زندہ رکھنے کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر، مختلف جماعتیں اور ادارے وقتاً فوقتاً ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں، تعاون کی راہیں تلاش کریں۔ کام کے امکانات اور اس کی مشکلات کا جائزہ لیں، اختلافِ رائے کو مخالفت، اور اظہارِ خیال اور احتسابِ نفس کو ملت کے انتشار و افتراق میں تبدیل ہونے سے بچائیں، وقت کے نئے مسائل اور زمانے کے نئے چیلنج کو سمجھیں اور اس کو قبول کرنے کی تیاری کریں، اپنے دین و پیغام کی حیات بخشی اور مسیحا نفسی، اپنی خداداد صلاحیتوں اور اپنے خلوص و صداقت اور سچی حب الوطنی سے اس ملک کو نئی توانائی، نیا استحکام اور نئی امنگ بخشیں۔ اخلاقی قیادت کے اس خلا کو پُر کریں جو سالہا سال سے اس ملک میں چلا آرہا ہے۔ پھر اس کو اس مقام پر لاکر کھڑا کرنے کی کوشش کریں کہ وہ مغرب کی بے خدا تہذیب اور بے ضمیر سیاسی و فکری قیادت کے زخم خوردہ اور قتیل مشرقی و ایشیائی ممالک کا سہارا بنے، مظلوموں کا ساتھ دے اور حق کی مدد کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ان مسلمانوں کے تعاون، خوش دلی اور گرم جوشی کے بغیر نہیں ہو سکتا جنکی ایک دو ملکوں کو چھوڑ کر سب سے بڑی تعداد اس ملک میں آباد ہے،

تعداد میں ہندوستانی

مسلمان خواہ تیسرے یا چوتھے

نمبر پر ہوں اپنی دماغی صلاحیت

اپنے شاندار علمی ورثے، اپنی نہ صرف ماضی بعید بلکہ ماضی قریب کی شخصیتوں اور اپنے بعض تعلیمی اداروں کی بدولت اسلامی ممالک میں بھی نمبر ایک کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ اس ملک کو ان مسلم عرب ممالک کی طلائی زنجیر سے ملانے کے لئے ایک مضبوط کڑی کا کام دے سکتے ہیں جو انڈونیشیا سے مراکش تک پھیلے ہوئے ہیں۔

جہاں تک اس عظیم و عزیز مقصد کا تعلق ہے اس کی اہمیت و افادیت کا کوئی مسلمان اور کوئی محبِ وطن ہندوستانی انکار نہیں کر سکتا لیکن اگر اس کا مقصد محض یہ ہے کہ حکومت یا برادرانِ وطن یا اکثریت کے فرقہ کو ان ملی مسائل سے آگاہ کیا جائے جن پر مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کا اتفاق ہے اور جن کی طرف اطمینان حاصل کئے بغیر وہ مسلسل ذہنی کشمکش، قلبی اضطراب اور شک و شبہ کی حالت میں مبتلا رہیں گے اور اس لئے ملک و وطن کی تعمیر کے لئے وہ گرم جوشی اور یکسوئی پیدا نہ ہوگی جو کہ اس ملک میں رہنے والے ایک ایک فرد سے توقع کی جاتی ہے اور جن کو مسلمان آزادی

تعلیم القرآن

از: مولانا محمد ادریس ندوی مرحوم

پڑوسیوں کے ساتھ برتاؤ

والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب۔ (نساء ۴) (اور خدا نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ (نیکی کا حکم دیا ہے)

ہمسایہ وہ دو آدمی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں! اسلام میں اس کا بھی بڑا حق مانا گیا ہے!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر یقین رکھتا ہے وہ پڑوسی کی عزت کرے اس کو دُکھ نہ دے"!

ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا"، صحابہؓ نے پوچھا کون یا رسول اللہ! فرمایا وہ جس کا پڑوسی اسکی شرارتوں سے محفوظ نہیں ہے!

فرمایا وہ مومن نہیں جو خود سیر ہو، اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے اس آیت میں پڑوسی کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں، ایک ہمسایہ قریب، دوسرے ہمسایہ بیگانہ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمسایہ قریب سے مراد وہ ہمسایہ ہے، جو عزیز اور رشتہ دار بھی ہو، اور بیگانہ وہ ہے جو رشتہ دار نہ ہو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمسایہ قریب کے معنی ایک مذہب والے کے ہیں اور بیگانہ سے مراد دوسرے مذہب والے ہیں، دوسرے مذہب والے پڑوسی کے ساتھ بھی نیکی کرنا چاہئے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ بکری ذبح کی۔ اُن کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا، انہوں نے گھر کے لوگوں سے پوچھا کہ تم نے میرے یہودی پڑوسی کو بھی بھیجا؟ کیونکہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سُنا ہے کہ مجھے جبریل ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنا دیں گے!

پڑوسی کی ان قسموں کے سوا ایک اور قسم بھی ہے، جس کو عام طور سے پڑوسی نہیں کہتے ہیں مگر وہ پڑوسی ہی کی طرح اکثر ساتھ رہتا ہے، اس کو قرآن نے "پہلو کا ساتھی" بتایا ہے، جیسے سفر کے ساتھی، پیشہ اور کام کے شریک، ان سب کے ساتھ بھی ہم کو نیکی کا برتاؤ کرنا چاہئے!

مسافروں اور مہمانوں کے ساتھ برتاؤ

وابن السبیل (نساء ۴) اور مسافر کے ساتھ نیکی کرو

مسافر ہو اپنے بیوی بچوں، عزیز و قریب، دوست اور مال و دولت سے الگ ہو کر سفر کرتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کے پاس کھانے کے لئے کھانا، پینے کے لئے پانی، سونے کے لئے بستر، اوڑھنے کے لئے چادر، اور سفر کے لئے خرچ بھی نہیں ہوتا ہے، ان کے ساتھ بھلائی کرنا ان کے آرام کی فکر کرنا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔

مسافر مہمان ہو کہ نہ ہو، امیر ہو کہ غریب ہو سب کے ساتھ نیکی کرنا چاہئے، حضرت ام شریکؓ ایک دولتمند صحابیہ تھیں، انہوں نے اپنے گھر کو مہمان خانہ بنا دیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس باہر سے جو مہمان آتے تھے وہ زیادہ تر انہی کے مکان پر ٹھہرتے تھے!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کے پاس گئے اور فرمایا، کیا مجھے خبر نہیں ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا بیشک فرمایا، ایسا نہ کرو نماز بھی پڑھو، اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو، کیونکہ تمہارے اوپر تمہارے بدن کا حق ہے، تمہاری آنکھ کا حق ہے، تمہارے مہمانوں کا حق ہے، اور تمہاری بی بی کا حق ہے۔

فرمایا، جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کا "جائزہ" عزت کے ساتھ دے۔ کہا گیا کہ یا رسول اللہ اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا، کہ ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے، اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا!

محسنِ انسانیت ؐ نے فرمایا

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غفر لامرأۃ مومسۃ مرت بکلب علی رأس رکی یلھث کاد یقتلہ العطش فنزعت خفھا فاوثقتھا بخمارھا فنزعت لہ من الماء فغفر لھا بذلک قیل ان لنا فی البھائم اجراً قال فی کل ذات کبد رطبۃ اجر۔

(متفق علیہ مشکوٰۃ صفحہ ۱۶۸)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی عورت کی جو فاحشہ تھی صرف اتنی سی بات پر مغفرت فرما دی کہ اس کا گذر ایک پیاسے کتے پر ہوا جو ایک کنویں کی مینڈ پر پیاس کی شدت سے زبان نکالے پڑا تھا اور دم توڑ رہا تھا، اس کو دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا بس فوراً اس نے اپنے سر کی اوڑھنی اتاری اور اپنے پیر کا جوتا اس میں باندھ کر کنویں سے پانی نکالا اور اسکو پلا دیا، بس دریائے رحمت جوش میں آگیا اور اسی بات پر اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا، صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ جانوروں کے ساتھ ہمدردی کا بھی ہم کو ثواب ملے گا؟ آپ نے فرمایا جی ہاں جانور تو جانور ہر جانور کے ساتھ ہمدردی کرنے پر تم کو ثواب ملے گا۔

عن ابن عمر و ابی ھریرۃ قالا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عذبت امرأۃ فی ھرۃ امسکتھا حتیٰ ماتت من الجوع فلم تکن تطعمھا ولا ترسلھا فتاکل من خشاش الارض۔

(متفق علیہ۔ مشکوٰۃ صفحہ ۱۶۸)

ابن عمر اور ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک عورت اتنی سی بات پر عذاب میں گرفتار ہوئی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا پھر نہ اس کو کھلایا پلایا اور نہ اسکو کھول کر چھوڑا کہ وہ چل پھر کر خود زمین کے کیڑے مکوڑے کھا لیتی۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تدخلون الجنۃ حتیٰ تؤمنوا ولا تؤمنوا حتیٰ تحابوا او لا ادلکم علی شئ اذا فعلتموہ تحاببتم افشوا السلام بینکم۔

(رواہ مسلم مشکوٰۃ صفحہ ۳۹۷)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک تم ایمان نہیں لاؤ گے، جنت میں نہیں جاؤ گے اور جب تک باہمی محبت نہ کرو گے پورے مومن نہیں ہو گے تو کیا میں تم کو وہ بات نہ بتا دوں کہ جب اس کے خوگر ہو جاؤ تو باہمی محبت کرنے لگو (وہ یہ ہے) کہ آپس میں ہر شخص کو سلام کیا کرو خواہ وہ تمہارا آشنا ہو یا نا آشنا۔

شرح:

جنت کیا ہے؟ یہ وہ متاعِ گراں ہے جس کے متعلق حدیث شریف سے صرف اتنا ہی پتہ ملتا ہے کہ اس کی نعمتیں نہ کسی نے دیکھیں، نہ کسی کے کانوں نے سنیں اور نہ کسی کے دل میں ان کا گذر ہوا، حدیث کا اسلوبِ بیان کتنا پیارا ہوتا ہے کہ اس متاعِ گراں کو رفتہ رفتہ اتنا ارزاں فرما دیا کہ گویا اسکی قیمت آخر میں صرف ایک لفظ "سلام" رہ گئی ہے۔

اس نعمتِ عظمیٰ کا حصول پہلے تو ایمان یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تصدیق قلبی کے ساتھ پڑھنا قرار دیا، اگرچہ اس کلمہ کا پڑھنا مشکل بھی کیا اور کسی صحیح حقیقت کی تصدیق میں دشواری ہی کیا، لیکن پھر اس کے حصول کا ذریعہ ایک ایسی صفت کو ٹھہرا دیا جو ہر شریف انسان میں قدرتاً ودیعت رکھی گئی ہے یعنی انس و محبت، لیکن انس و محبت کا توجہ اللہ ہونا پھر ایک ٹیڑھی کھیر ہے، اس لئے محبت کے حصول کا ذریعہ ایک ایسے خوشنما کلمہ کو ٹھہرا دیا جس کو زبان سے ادا کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔

اب اگر اسی سبق کو آپ یوں پڑھیں تو وہ اور آسان نظر آتا ہے یعنی کثرت سے ایک دوسرے کو سلام کرنے سے محبت پیدا ہوتی ہے اور اس محبت سے ایمان کی شیرینی دل میں اترنے لگتی ہے اور اس مختصر راستہ سے اگر کوئی چاہے تو "خدا کی جنت" بڑی آسانی سے مل سکتی ہے۔

"دانا ہو تو ایسا"

اور حکومت خود اختیاری کا بہترین ثمرہ اور تحفہ سمجھتے ہیں یعنی ان کے خاندانی اور معاشرتی قوانین پرسنل لا" (جو ان کے مذہب کا جزو اور ان کے آسمانی قانون شریعت کا ایک حصہ ہیں) کا تحفظ مذہبی تعلیم۔ اپنے عقائد اور مسلک زندگی کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے کی آزادی ان کی اس زبان (اردو) کے باقی رہنے اور پھلنے پھولنے کی نہ صرف اجازت بلکہ انتظامات جسمیں ان کی مقدس زبان عربی کے بعد سب سے بڑا اسلامی سرمایہ واثاثہ ہے اور جو ان کی آئندہ نسل کے اسلام سے وابستہ رہنے کا سب سے آسان اور محفوظ ذریعہ ہے۔ ان کے اقلیتی اداروں (ان میں سب سے عظیم و وسیع ادارہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے) کا ان کے انتظام واختیار میں رہنا جہانتک ان مسائل وحقائق سے حکومت کو آگاہ کرنے یا برادران وطن کو ان کے بارے میں مطمئن کرنے کا تعلق ہے۔ تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ اس مقصد کے لئے بار بار اور جلد جلد مسلمانوں کی دورے سے کنونشن کا انعقاد ہے، جو عزیز ان ملت سطر [illegible] بنتے ہیں کہ ہمسایہ قوم بعقاد ایک جمہوری ملک کے لئے جیسا کہ ہندوستان ہے کوئی صحتمند علامت نہیں ہے، ایسے کنونشن کے بار بار انعقاد کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ مسلمان اقلیت یا بصحیح الفاظ میں ۶ کروڑ کی ملت کو ابھی تک اپنی بات سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کا سلیقہ نہیں آیا اور وہ موثر اظہار خیال یا اپنے احساسات وجذبات کی ترجمانی کی صلاحیت سے محروم ہے یا یہ کہ ہمارے رہنما اور سربراہ اپنے پہلو میں وہ دل نہیں رکھتے جو اپنے ہم وطنوں اور ان پرانے ساتھیوں کی اذیت وکرب سے متاثر ہوں، جنھوں نے ان کے دوش بدوش آزادی کی جنگ لڑی ہے اور جنھوں نے اپنی زندگی اور موت اسی ملک سے وابستہ کر دی ہے۔ میں ان میں سے کسی ایک بات کو بھی کسی ایک فریق کے شایان شان نہیں سمجھتا۔ بلکہ اسکے لئے اس کو ایک توہین اور ازالہ حیثیت عرفی کا مرادف گردانتا ہوں۔ میں یہ ماننے کے لئے بھی تیار نہیں کہ جس ملت نے ابو الکلام جیسا قادر الکلام مولانا محمد علی جوہر جیسا جوہر قابل، عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا جادو بیان، سید سلیمان ندوی جیسا عظیم مصنف، حفظ الرحمٰن جیسا صاف گو اور دلیر انسان مفتی کفایت اللہ اور مولانا ابو المحاسن سجاد جیسے اعلیٰ دماغ اور دستور وقوانین کے رمز شناس پیدا کئے وہ اپنا مقدمہ پیش کرنے اور مسئلہ سمجھانے سے چند برس میں قاصر ہو جائے۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ اکثریت کے فرقہ میں جس میں گاندھی جی جیسا درد مند دل رکھنے والا کبھی ساگر۔ داس جیسا صاف ذہن ودماغ کا انسان سبھاش چندر بوس جیسا حقیقت پسند وفراخ دل، جواہر لال جیسا محب وطن اور جری، راج گوپال آچاریہ اور دا [illegible]

کرشن جیسے واقعیت پسند اور فاضل رہنما پیدا کئے وہ ان حقائق کے ادراک اور ان کی قدر کرنے والے افراد سے یکسر خالی ہو جائے اردو کے مشہور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی نے تو اپنی مشکل یہ کہہ کر آسان کرلی تھی کہ

یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اگر محض دو افراد کا معاملہ ہو تو یہ بات بہت آسان ہے لیکن اگر کسی جمہوری ملک میں جس کو اپنی رواداری فراخدلی اور سچی جمہوریت پر بجا طور پر ناز ہے،

۶ کروڑ کی ایک پوری کی پوری ملت کو اس کا شکوہ ہو کہ مسلسل ۳۰ برس تک وہ اپنے بنیادی مسائل پیش کرتی رہی اور اس کا یقین دلاتی رہی کہ یہ مسائل اس کے لئے روٹی کپڑے، دوا، علاج، تعلیم اور ضروریات زندگی کی فراہمی سے کم اہمیت نہیں رکھتے بلکہ انکی اہمیت ایک مسلمان کی حیثیت سے ان سے زیادہ ہے۔ جس طرح مچھلی کو پانی سے نکال کر زیادہ دیر تک زندہ نہیں رکھا جاسکتا، یہ ملت ان حقوق ومواقع سے محروم رہکر بحیثیت ملت زندہ اور مطمئن نہیں رہ سکتی لیکن ابھی تک ان حقائق کو پورے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا اور مسلمانوں کو ہر چند سال کے وقفہ کے بعد ایک ملی کنونشن کے انعقاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

جون سنہ ۱۹۶۱ء میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے اسی دہلی میں مسلمانان ہند کا ایک کنونشن منعقد کیا تھا جس کی صدارت جنگ آزادی کے پرانے رہنما اور سپاہی، انڈین نیشنل کانگریس کے سابق سکریٹری۔ اس کی ورکنگ کمیٹی کے قدیم رکن اور سابق وزیر حکومت برائے امور خارجہ ڈاکٹر سید محمود نے کی۔ پھر اس کے تین سال کے بعد ۸، ۹ اگست سنہ ۱۹۶۴ء کو لکھنؤ میں ڈاکٹر صاحب ہی کی صدارت میں وہ تاریخی بلکہ تاریخ ساز مسلم مشاورتی اجتماع منعقد ہوا جس کے نتیجہ میں مسلم مجلس مشاورت وجود میں آئی، جس کے پلیٹ فارم پر مسلمانوں کی تمام جماعتوں کے رہنما اور ہر مکتب فکر کے نمائندے جمع ہوئے اور انہوں نے ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے پانچ طویل وعریض دورے کئے۔ جن کا ان ریاستوں کے ہندو مسلمانوں نے ایسا استقبال کیا جس کی نظیر تحریک خلافت اور ہندو مسلم اتحاد کے اس دور کے بعد دیکھنے میں نہیں آئی جب گاندھی جی علی برادران کی معیت میں شہر شہر کا دورہ کر رہے تھے آخر میں ۱۹، ۲۰ دسمبر ۱۹۷۰ء کو (یادش بخیر) ڈاکٹر محمد عبد الجلیل فریدی مرحوم کی دعوت پر نئی دہلی میں آل انڈیا مسلم پولیٹیکل کنونشن منعقد ہوا۔

جہاں تک مسلمانوں کے دینی تعلیم کے مسئلہ کا تعلق ہے اس کے لئے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کی دعوت پر بمبئی میں مسلمانوں کا تعلیمی کنونشن منعقد ہوا جسمیں ملک کے ممتاز علماء، مفکرین اور ماہرین تعلیم نے شرکت کی اور اس کے نتیجہ میں جمعیۃ علماء کا دینی تعلیمی بورڈ وجود میں آیا۔ اس کے بعد ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء اور یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو ضلع بستی میں قاضی محمد عدیل عباسی ایڈوکیٹ کی دعوت پر صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی جسمیں مسلمانوں کی تمام جماعتوں کے تقریباً ذمہ داروں نے شرکت کی اور اس کے نتیجہ میں دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش وجود میں آئی۔ جس نے لکھنؤ، الہ آباد اور مراد آباد میں عظیم الشان سالانہ جلسے کئے۔

جہاں تک مسلم پرسنل لا کا تعلق ہے دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں اس کے تحفظ کے لئے پہلا جلسہ منعقد ہوا جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور مکاتب فکر کی مکمل نمائندگی کے لحاظ سے حیرت انگیز تھا۔ اس کے نتیجہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ وجود میں آیا، جس کے متعلق بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا نمائندہ پلیٹ فارم ہے۔ اور اس میں ہر مسلم فرقے اور ہر مکتب خیال کی موثر نمائندگی ہے۔ اس بورڈ نے بمبئی، حیدر آباد اور بنگلور میں اپنے جلسے منعقد کئے، ان جلسوں کے شرکاء کی تعداد اور جوش نے دور خلافت کی یاد تازہ کر دی۔ اس بورڈ نے نہ صرف ان مسائل کی اہمیت ذہن نشین کی بلکہ ان کا تعلق اور ان کی وضاحت بھی کی اور اس کے وفود ذمہ داران حکومت سے بار بار ملے۔

جہاں تک مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ کا تعلق ہے آل انڈیا مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی کی طرف سے ۱۰، ۱۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو دہلی میں ایک عظیم الشان کنونشن منعقد ہوا جسمیں شمال وجنوب کے تمام سربرآوردہ مسلم لیڈر اور سیاسی جماعتوں کے رہنما شریک ہوئے۔ رہا اردو کا مسئلہ تو اس کے لئے بھی مختلف پلیٹ فارموں سے اور مختلف کانفرنسوں اور کنونشنوں میں اس کے تحفظ، اسکی بقا اور ترقی اور اس کی تعلیم کا خاص بندوبست اسکے علاقائی زبان تسلیم کرنے مسلمان بچوں کے لئے اس کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے برابر آواز بلند کی جاتی رہی۔

اس سب کے بعد اس کے کہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا کہ مسلمان اپنے مسائل ومطالبات کو اکثریت کے فرقے یا ذمہ داران حکومت کے سامنے پیش نہیں کر سکے۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے نئی زبان عطا ہونے کی دعا وتمنا کا کوئی موقع نہیں ہے البتہ درد وتکلیف کے احساس کے ساتھ کہ یہ کوئی خوش گوار بات نہیں اس کی دعا وتمنا ضرور کی جاسکتی ہے کہ اس ملک کے ذمہ دار اسی دل سے جس سے وہ بے زبان جانوروں کا درد محسوس کرلیتے ہیں اور ان کی حفاظت کے لئے سرگرم ہو جاتے ہیں اس ملت کا درد محسوس کریں جو ۳۰ برس سے اپنے بچوں اور اپنی آئندہ نسلوں کے مستقبل کی [illegible] اپنے ملی تشخص اور اپنی مذہبی آزادی کی طرف سے اندیشے میں مبتلا ہے۔ اس کے لئے "نئے دل" کے پیدا ہونے کی بالکل ضرورت نہیں جس کی غالب نے اپنے محبوب کے لئے دعا کی تھی تھوڑی دیر کے لئے اس پرانے دل سے ان مسائل پر متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔

حضرات! انسان کو قدرت کی طرف سے دو بڑی صلاحیتیں بلکہ نعمتیں عطا ہوئی ہیں، ایک، سود وزیاں اور نفع ونقصان میں موازنہ کی صلاحیت دوسرے واقعات سے سبق لینے کی قابلیت۔ جہاں تک پہلی صلاحیت کا تعلق ہے اس سے انسانی افراد اور انسانی اداروں نے جن میں تہذیبیں اور حکومتیں دونوں شامل ہیں بڑا فائدہ اٹھایا ہے اور اس کے ذریعہ وہ بڑے مصائب اور بڑے نقصانات سے بچ گئے ہیں۔ اب ہمارے قائد ورہنما اور ذمہ داران حکومت غور کریں کہ کسی ایک انتہا پسند طبقہ کے اثر یا مطالبہ کی وجہ سے ان مسائل کو معلق رکھنا یا پرانی سیاسی تلخیوں کے نتیجہ میں (جو کسی ناعاقبت اندیش سیاسی جماعت کی غلط روی نے پیدا کر دی تھی) ان مسائل سے مسلسل آنکھیں بند رکھنا صحیح ہے جس کے نتیجہ میں ہندوستان کی آبادی کا ایک اہم عنصر اضطراب واشتباہ کا شکار ہے یاد رہے کہ یہ وہ عنصر ہے جو فطری صلاحیتوں سے مالا مال، قوت عمل، عزم وجذبہ سے بھرپور، مہم جوئی اور خطرات پسندی کی اس صلاحیت سے بہرہ مند ہے جس سے بڑا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور جس کی ہمت اور قلندرانہ جرأت نے اس سیاسی صورت حال کے تبدیل کرنے میں بڑی مدد کی جو ۱۹ مہینے قائم رہی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ترکمان دروازہ کا المیہ، مظفر نگر اور سلطانپور کے شہیدوں کا خون نہ ہوتا تو وہ آندھی نہ اٹھتی جو اندرا گورنمنٹ کو اڑا کر لے گئی، ایک ایسی

اقلیت یا فرقہ کو مسلسل بے چینی اور اضطراب میں مبتلا رکھنا اور اس کی توانائیوں کو ملک وطن کے استحکام اور اس کی سربلندی کے کام پر لگنے کے بجائے، اپنے مسائل ومطالبات کے پیش کرنے میں مصروف رکھنا دانشمندی اور ملک کے ساتھ خیر خواہی کی بات ہے؟ یا اس کو مطمئن کرکے یکسر ملک ووطن کے مفاد میں استعمال کرنا، اور اس کے ذریعہ سے پورے مشرق وسطی اور وسط ایشیا کے ملکوں میں اعتماد واحترام کی فضا پیدا کرنا دانشمندی اور ملک کے ساتھ خیر خواہی کی بات ہے؟ اس سب کا جواب قومی دھارے کے ساتھ مسلمانوں کے بہنے کا وہ مطالبہ نہیں ہے جو ایک ریکارڈ کی ہوئی آواز کی طرح یا ایک روایتی طوطے کی رٹ کی طرح دہرایا جاتا رہتا ہے، سیاسی کارگاہ اور قوموں کے مسائل کے میدان میں "ون وے ٹریفک" کا اصول نہیں چل سکتا۔ یہ حقائق کی دنیا ہے اور یہاں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کا معاملہ ہے اور "جیو اور جینے دو" کا اصول کارفرما ہے۔

جہاں تک دوسری صلاحیت یعنی واقعات سے سبق لینے کا تعلق ہے، آپ نے دیکھا کہ ملک کی آبادی کی بے چینی نے حالات میں کیا انقلاب برپا کر دیا، غیر طبعی حالات جن میں باقی رہنے کی فطری صلاحیت نہیں ہے، کسی بڑی سے بڑی کوشش وسازش سے بھی زیادہ دن باقی نہیں رہ سکتے،

ہمارے موجودہ رہنماؤں

اور ذمہ داروں کو اس سے پوری احتیاط کرنی چاہئے کہ اس ملک کی آبادی یا اس کا کوئی قابل ذکر عنصر خود داری وخود اعتمادی کی دولت سے محروم ہو، وہ اپنے کو غلام، بے بس اور ذلیل محسوس کرے، بدیسی حکومت کی غلامی کے احساس سے اپنے ہم وطنوں کی غلامی کا احساس زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ ذلت آمیز ہے۔

حقائق کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ وہ گھٹن، اور وہ اندر اندر کی تکلیف واذیت ہے جو بالآخر اپنے نکلنے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے اور بڑی سے بڑی رکاوٹ کو دور کر دیتی ہے، اس کا نتیجہ کبھی یہ ہوتا ہے کہ قوم اپنے کو غلامی کے اس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے جو ان پر مسلط کر دیا جاتا ہے اور یہ قوم کی ہلاکت اور ملک کی بدقسمتی ہے یا پھر وہ اس سے گلو خلاصی کی کوشش کرتی ہے اور ملک میں ایک بھونچال آتا ہے اور پرانے سانچے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ملک کی تعمیر وترقی کا کام معتدل حالات اور اہل ملک کے تعاون ہی سے ہو سکتا ہے۔ حکومت نے اس حقیقت کو نظر انداز کیا، اور اس ملک کے باشندوں نے (جن میں مسلمان پیش پیش تھے) اپنے ضمیر کے زندہ ہونے، اور اپنی خود داری اور اپنی مردانگی کا ثبوت دیا کہ اتنا بڑا ملک جس نے جدید دنیا میں آزادی کی سب سے بڑی لڑائی لڑی تھی اور اس حکومت کی غلامی سے رہائی حاصل کی تھی، جس کے حدود سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔ حالات کے سامنے اس طرح سپر ڈالنے کے لئے تیار نہیں۔ اس موقع پر مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے سامنے اس تاریخی خط کا ایک ٹکڑا پیش کروں جو مذہب واخلاق کے ایک ادنیٰ طالب علم اور گوشہ نشین انسان نے ایمرجنسی کے دوران ۲۵ اگست سنہ ۱۹۷۶ء کو اس وقت کی وزیر اعظم صاحبہ مسز اندرا گاندھی کے سامنے پیش کیا تھا اور اس کے مندرجات اور مضمرات پر پوری آزادی کے ساتھ گفتگو کی تھی۔ اس میں صورت حال کی پوری تصویر آگئی ہے۔ اس خط میں کہا گیا ہے:۔

سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اہل ملک اس خود داری اور خود اعتمادی کی دولت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں جو آزادی کی تحریک کانگریس اور خلافت کی جدوجہد گاندھی جی، مولانا آزاد، علی برادران، نہرو خاندان اور ہمارے قابل احترام سیاسی رہنماؤں کی کوششوں سے بڑی قربانیوں سے اس ملک میں پیدا ہوئی تھی، سارا ملک اپنے کو غلام، بے بس اور ذلیل محسوس کر رہا ہے، اور اس کو شاید ہی کسی وقت یہ احساس ہوتا ہو کہ یہ ایک آزاد جمہوری ملک ہے جو ہر قسم کے جور وتشدد سے محفوظ ہے اور جس نے اس جدوجہد کے ذریعہ جس کی نظیر دوسرے ملکوں کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، اپنے کو بدیسی حکومت کی غلامی سے آزاد کرایا ہے، اور اب وہ اپنی مرضی کے مطابق اس ملک کا نظم ونسق چلا رہا ہے۔"

آگے چل کر اس خط میں کہا گیا ہے:۔

اگر کوئی قوم بزدلانہ اور ہلاکانہ سیرت اختیار کرلے، اس کے اندر سے خود داری، بلند حوصلگی، اور اخلاقی جرأت کی صفات نکل جائیں، وہ پیسے کی خاطر یا ڈر دھونس سے بالکل اپنی مرضی کے خلاف ہر کام کرنے لگے وہ یہ سمجھنے لگے کہ ہر قیمت پر زندہ رہنا اور ملازمت وعہدہ کو برقرار رکھنا ضروری ہے، اور اس میں ضمیر، اصول غیرت وخود داری کا کوئی سوال نہیں، تو پھر اس ملک کے لئے خواہ وہ سیاسی اقتصادی اور تعلیمی حیثیت سے کتنا ہی ترقی کر جائے کچھ خوش ہونے کی بات نہیں کہ ملک قوم سے ہے، قوم ملک سے نہیں، اور قوم اپنی سیرت، اندرونی صفات، خود داری اور اخلاقی جرأت سے ہے معیار زندگی کے بلند ہو جانے اور وسائل معیشت کے حاصل ہو جانے سے نہیں"

موجودہ حکومت سے جس میں جنگ آزادی کے پرانے سپاہی، آزمودہ کار منتظم اراکین حکومت اور سرد وگرم چشیدہ سیاسی رہنما اور قومی کارکن شامل ہیں، بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ان غلطیوں سے بچنے کی اور ان واقعات سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرے گی جو ابھی چند مہینے پہلے اس ملک میں رونما ہوئے تھے

اور خوشگوار وگرمجوشی، ہم آہنگی، باہمی اعتماد اور مخلصانہ اتحاد کی وہ فضا پیدا کرنے کی جدوجہد کرے گی، جس کے بغیر یہ ملک نہ اپنی مشکلات پر قابو پا سکتا ہے، نہ دنیا کے سیاسی نقشے میں وہ مقام حاصل کر سکتا ہے، جس کا وہ اپنی کثیر آبادی، عظیم وسائل اپنے اہم جائے وقوع اور مشرقی وایشیائی ممالک سے تہذیبی وثقافتی رشتوں کی وجہ سے مستحق ہے۔ تیس برس کی مدت جو قوموں اور ملکوں کی زندگی میں، اور خاص طور پر اس سرعت وانقلاب کے دور میں ایک صدی کے برابر ہے، ہمارے ملک کے رہنماؤں اور سربراہوں نے ایک ایسے تجربہ میں گزار دی، جس میں جذبات عقل پر حاوی رہے، حالات کے تقاضوں اور واقعات پر تاریخ کے گھنے سائے، ملک کی تعمیر کے نئے ساینوں اور نگاہ کے جدید زاویوں پر اگر غالب نہیں رہے تو اثر انداز ضرور رہے، اب ہم کو مستقبل کی تعمیر کے لئے ایک ایسا قدم اٹھانے کی ضرورت ہے جس میں ذہانت بھی اور اخلاقی جرأت بھی، جس کی بنیاد تخیلات پر نہیں حقیقت پسندی پر ہو اور ایک ایسی فضا تیار کی جائے جس میں ہر فرقہ اپنے ملی مسائل سے مطمئن ہو کر اپنی تمام توانائیاں، ذہانتیں اور صلاحیتیں جو اس کو اس کے مذہب نے اس کی نسلی خصوصیات یا تہذیب نے عطا کی ہیں پوری جمعیت خاطر پوری یکسوئی اور پورے جوش وخروش کے ساتھ ملک کے استحکام اور پوری انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دے، اگر یہ کنونشن کسی درجہ میں بھی اس مقصد کے لئے مفید ہو سکتا ہے تو وہ نہ صرف مسلمانوں کے لئے مبارک، نہ صرف اقلیتوں کے لئے مفید ثابت ہوگا بلکہ پورے ملک کے لئے باعث رحمت وبرکت ہوگا۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اپنی گزارش ختم کرتا ہوں اور خدائے قادر وتوانا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہماری صحیح رہنمائی کرے، ہم کو خلوص عطا فرمائے اور ہمارے دلوں میں انسانیت کا درد اور ملت کے تحفظ کا وہ جذبہ پیدا کرے، جو تمام جماعتی، گروہی عصبیت، لسانی اختلافوں اور دلچسپیوں پر غالب رہے۔

(ابو الحسن علی)

[illegible]

پیام ندوۃ العلماء

محمد الحسنی مرحوم مدیر البعث الاسلامی ندوۃ العلماء لکھنؤ

ندوۃ العلماء کے تخیل اور پیغام اور عصر حاضر میں اسکی اہمیت اور ضرورت کو سمجھنے کے لئے ایک مختصر اور مفید کتاب۔

ناشر: دفتر اجلاس ندوۃ العلماء لکھنؤ

ملنے کا پتہ: مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۹۳ ندوہ۔ لکھنؤ
" " " " مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

اس خطۂ زمین کو دین فطرت کی نعمت ملتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی

کلیسا نے علم و عقل کی راہ روکی جس سے اس ملک کا رُخ خالص مادیت کی طرف ہو گیا ۔ یہ ملک ایک نئی کروٹ لے رہا ہے اور امید کی نئی کرن پیدا ہو رہی ہے ۔

(۱۶ جون ۱۹۷۷ء کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ کے ڈیوینیٹی کالج ہال میں خطاب۔ اس کا انگریزی ترجمہ مزمل حسین صدیقی ندوی نے کیا، تعارفی تقریر اور اناؤنسر کے فرائض مدثر حسین صدیقی نے انجام دیئے۔ جلسے میں یونیورسٹی کے اساتذہ، اسکالرز اور طلبہ نیز مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مندوبین کی کثیر تعداد شریک تھی۔ تقریر ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے مشتاق بھوپالی طالب علم دار العلوم ندوۃ العلماء نے قلمبند کی۔)

بڑا خوش قسمت اور بڑا بد قسمت:

"لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنٰه اسفل سافلین"۔

میرے دوستو اور بھائیو! میں اپنی آج کی گفتگو کا آغاز ایک ایسے جملہ سے کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف رہنمائی ان ہی آیتوں سے ہوئی جو ابھی پڑھی گئیں اور یہ ایک طرح کا القاء کہیے کہ مجھے اس سے آپ سے بات کرنے کا راستہ مل گیا۔ میں اپنی تقریر کا آغاز ایک ایسے جملہ سے کرتا ہوں جو شاید آپ کے لئے اور بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کے لئے خلاف توقع اور چونکا دینے والا ہو، مغرب کا یہ خطہ جو یورپ سے امریکا تک پھیلا ہوا ہے یہ بڑا خوش قسمت ہے اور بڑا بد قسمت۔ آپ ایک ہی جملہ میں اتنے بڑے تضاد کو سن کر تعجب کریں گے لیکن ابھی آپ کے سامنے جو آیت پڑھی گئی ہے وہ خود ایک بہت بڑی حقیقت کو بیان کرتی ہے اور وہی واقعہ اس خطۂ زمین کا ہے جس کو خدا نے دنیا کی قیادت عطا کی بہت سے ایسے اسباب کی بنا پر جس کی تفصیل مشکل ہے اور میں نے اپنی کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین (ISLAM AND THE WORLD) اس کے انگریزی ترجمہ میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ مغرب کو قیادت کیسے حاصل ہوئی، جو انسان کا معاملہ ہے وہی تقریباً اس خطۂ زمین کا معاملہ ہے، ایک ہی وقت میں بڑا خوش قسمت ہے اور بڑا بد قسمت بھی، اور کاش کہ واقعہ اتنا ہی ہوتا کہ یہ اپنی ذات سے خوش قسمت اور بد قسمت ہوتا تو کوئی بڑی ٹریجڈی اور کوئی بڑا سانحہ نہ ہوتا، تاریخ انسانی میں ہمیں ایسی قوموں اور ملکوں کا سراغ ملتا ہے جو اپنی ترقی کے نقطۂ عروج پر پہونچ گئے تھے پھر اس کے بعد ان کا زوال شروع ہوا اور وہ بام ثریا سے گر کر تحت الثریٰ میں پہونچ گئے، اگر یہ ایک تنہا ملک کا معاملہ ہوتا تو ہمیں اس سے دلچسپی کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن جب کسی ملک کو قیادت کا مقام حاصل ہو اور وہ دنیا کے حالات پر اثر انداز ہو اور اس کی خوش قسمتی اور بد قسمتی انفرادی نہ رہے، کسی خطہ تک محدود نہ ہو بلکہ اس کا اثر دور دور پڑے، انسانیت اور قسمت انسانیت پر پڑے تو واقعہ کی سنگینی بہت بڑھ جاتی ہے، اگر مغرب کا یہ خطہ جو یورپ سے شروع ہو کر امریکہ پر ختم ہوتا ہے .... اگر یہ اپنی ذات سے خوش قسمت اور بد قسمت ہوتا، تو ہمیں اور آپ کو اور دنیا کے رہنے والوں کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہوتی لیکن چونکہ اس کو قیادت کا مقام حاصل ہے اس لئے اس کی خوش قسمتی اور بد قسمتی صرف اس کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ پوری انسانی قوموں اور انسانی مجموعہ پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ آپ غور کریں گے کہ میں ایک وقت ہی میں نہیں بلکہ ایک سانس میں اس کو خوش قسمت بھی اور بد قسمت بھی کہہ رہا ہوں آپ کو اس کی وجہ پوچھنے کا حق حاصل ہے۔

خوش قسمت اس وجہ سے کہ خدا نے اسکو اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا، یہاں کے رہنے والوں کو ایسی قوت ارادی، ایسا جوش عمل، ایسی ذہانت، ایسا کام کرنے کا جذبہ، ایسی توانائی عطا کی کہ اس نے اس زمین کو جنت کا نمونہ بنا دیا، خدا کی قدرت کے رازوں کا انکشاف کیا، کائنات کی قوتوں کو مسخر کیا۔ اقبال کے الفاظ میں "سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا، ستاروں کی گذرگاہوں کو دریافت کیا،" اس نے اس مٹی کو سونا بنا دیا، اب یہ زمین سونا اگلتی ہے، یہاں کی فضا سے "من" برستا ہے، اور یہاں بائبل کی زبان میں دودھ اور شہد کے دریا بہتے ہیں، یہ نتیجہ ہے ان قوموں کے جوش عمل کا، ان کے جذبۂ مسابقت کا، ان کی بے چین فطرت کا، اور ان کے نہ تھکنے والے نہ ہارنے والے عزم کا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس خطۂ زمین کو جو یورپ سے یہاں تک پھیلی ہوئی ہے، قدرتی دولتوں سے مالا مال کیا، خدا کے جتنے خزانے ہیں وہ سب کے سب یہاں موجود ہیں، اور پھر موجود ہی نہیں بلکہ یہاں وہ ہاتھ بھی موجود ہیں جو ان خزانوں کو برآمد کریں اور قدرت کی دولت سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اس لحاظ سے یہ ملک بڑا خوش قسمت ہے اور اس نے اپنی خوش قسمتی کا سکہ صرف اس ملک کے رہنے والوں پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر بٹھا دیا ہے اور آج ساری دنیا ان کی دریوزہ گر ہے۔ دنیا کی ہر قوم ان کے سامنے جھولی پھیلائے، ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے اور بھیک مانگتی ہے واقعہ یہ ہے کہ آج دنیا انکے دروازہ کی سائل بنی ہوئی ہے، اور انہوں اپنی ذہانت سے اپنے حسن تنظیم سے زندگی کو اس طرح منظم کیا، جس طرح انہوں نے ان طاقتوں سے فائدہ اٹھانے کا سبق سیکھا ہے اس سے ساری دنیا فیض پا رہی ہے، انہوں نے مادی اور اقتصادی طور پر اپنی افادیت اور ذہنی صلاحیت کا سکہ قائم کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے آپ ان کو خوش قسمت کہیں، اس میں ذرا مبالغہ نہیں، اور اس کے لئے ثبوت کی ضرورت نہیں، اگر ہم ہندوستان میں، مصر میں، عراق میں، سعودی عرب میں، مشرق کے کسی ملک میں ہوتے تو اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت تھی مگر ہم اور آپ جہاں بیٹھے ہیں اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے

عیاں را چہ بیان

ہم یہاں موجود ہیں اور خود اس ملک کی دولت سے اور آسائشوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں، اس لحاظ سے آپ اس کی خوش قسمتی پر جتنا رشک کریں اور اس خوش قسمتی کی جتنی داد دیں اور جتنا سراہیں سب بجا ہے، میں کسی عصبیت کو جائز نہیں سمجھتا کہ اسلامی تعصب سے، اسلامی تعصب تو نہیں ایشیائی تعصب سے، قومی تعصب سے، نسلی تعصب سے کام لیں۔ یہ ایک حقیقت ہے روز روشن کی طرح ہمارے سامنے ہے لیکن اس کے باوجود یہ ملک بد قسمت ہے — یہ الفاظ میں تو بڑی جرأت کے ساتھ کہہ رہا ہوں اور بہت سے بھائیوں کے لئے یہ اجنبی اور نامانوس ہوں گے، لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے یہ واقعہ ہے کہ یہ ملک بد قسمت ہے۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا:

اس ملک کی نہیں بلکہ انسانیت کی یہ بد قسمتی ہے کہ اس ملک نے مادی میدان میں جو فتوحات حاصل کیں اور اس میں جو ریکارڈ قائم کیا اور جس طرح اس نے اس زمین کو گلزار، لالہ زار بنا دیا اور اس کو جنت کا ایک نمونہ بنا دیا۔ بڑی خوش قسمتی کی بات ہوتی اور دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی اگر اس خطۂ زمین کو صحیح رہنمائی حاصل ہوتی اور اس کو دین صحیح کی نعمت ملی ہوتی، اور جس طرح اس نے مادیات کی طرف توجہ کی اخلاقیات کی طرف توجہ کرتا، اور جس طرح اس نے آفاق میں خدا کی نشانیاں دیکھی ہیں — اور "سنریهم آیاتنا فی الآفاق" پر عمل کیا ہے ویسے ہی "انفس" "خدا کے پیدا کئے ہوئے دل، عطا کی ہوئی روح"، اور لطیف احساسات میں بھی خدا کی نشانیاں دیکھتا اور دنیا کو دکھاتا اور اس کی ذہانت صرف اس پر مرکوز نہ رہتی کہ وہ قدرت کے رازہائے سربستہ فاش کرے بلکہ وہ اپنے دل اور روح کے اسرار سے اور انسانی دل کی گہرائیوں سے بھی واقف ہو اور اس کو معلوم ہو کہ جتنی یہ کائنات وسیع نظر آتی ہے اور سیاروں کا اس نے جو رقبہ اور حجم دریافت کیا اور جن جن چیزوں کا انکشاف کیا اور اب آخر میں چاند پر پہونچ کر ایک اور نئی فتح حاصل کی ہے اگر اسی تناسب سے یا اس سے بہت کم تناسب سے انسانی روح کی حقیقت کی طرف توجہ کرتا اور اسے خدا کی صحیح معرفت حاصل ہوتی اور انسانی قلب کی وسعت، طاقت، حرارت، محبت اور اس کی لطافت اور معصومیت بے لوثی اور بے غرضی کو بھی اگر یہ ملک معلوم کرتا، اور اس قلب کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا اور اس کے اندر کی طاقتوں سے آشنا ہوتا، اور

ان سے کام لینے کی اس کو توفیق ہوتی تو اس کو معلوم ہوتا کہ یہ پوری کائنات اگر دل کے اندر ڈالدی جائے تو گم ہو جائے جس طرح ایک حقیر کنکری بحر اوقیانوس میں ڈالدی جائے اور پتہ بھی نہ چلے کہ وہ کہاں گئی اسی طرح یہاں کے مغربی انسان کو اس کا علم ہوتا کہ قلب انسانی میں کتنی گہرائی ہے، کہ اگر کائنات اس میں ڈالدی جائے تو پتہ بھی نہ چلے کہ کہاں گئی۔ اس کو انسانیت کا مقام معلوم ہوتا کہ انسان کیا ہے۔ اس کو تو جمادات، حیوانات، نباتات کا مقام معلوم ہے، کیمسٹری پر، بیالوجی پر، ذیولوجی پر اس نے جو محنتیں کی ہیں اور اپنی ذہانت صرف کی ہے اور جس کی ذہانت کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے اس لئے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے "لیس للانسان الا ما سعی وان سعیه سوف یری ثم یجزاه الجزاء الاوفی"۔ فرمایا "کلا نمد هؤلاء وهؤلاء من عطاء ربك وما كان عطاء ربك محظورا"۔ انسان اپنی کوشش کے لئے جو میدان بھی انتخاب کریگا خدا کامیابی دے گا کہیں کوئی راشننگ نہیں ہے کوئی بندش نہیں ہے کہ یہاں سے آگے تم ترقی نہیں کر سکتے۔ نیچرل لاز اور فزیکل یونیورس پر مغرب نے جو محنت صرف کی ہے اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ یہ کائنات سمٹ کر رہ گئی ہے اور انسان نے اپنے مقاصد و مفادات کے لئے اس کو مسخر کر لیا ہے۔ اسی طریقہ سے رخ قلب اور ایمان و یقین پر یہ ملک محنت کرتا اور ذہانت صرف کرتا تو اس کو انسانیت کا صحیح مقام معلوم ہوتا۔ اس کو ایک حیوان کا فائدہ معلوم ہے ایک جانور اور ایک درخت پر جب اس نے محنت کی تو اس نے درخت سے وہ برآمد کیا جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طریقہ سے دواؤں کے خواص اور جتنی بھی چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں ان کی حقیقت کی طرف جب اس نے توجہ کی تو نئے عالم دریافت کئے، پہلے تو اس عالم کے علاوہ دوسرے عالم ماننے میں لوگوں کو بہت ہی اشکال تھا اور جو لوگ یہ کہتے تھے کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی دنیائیں ہیں تو کلیسا نے انہیں بڑی سخت سزائیں دیں، لیکن اب ہر چیز میں نئی نئی دنیا دریافت ہو رہی ہے۔ اسی طرح اگر اس کو انسانیت کا مقام معلوم ہوتا، اگر شرف انسانی سے یہ واقف ہوتا کہ خدا نے انسان کو کیا درجہ دیا اور اس کا کیا مقام ہے تو آج دنیا کی قسمت کچھ اور ہوتی، دنیا کے حالات کچھ اور ہوتے۔

مناسب ترین مذہب:

اس دنیا کی تاریخ میں دو واقعات ایسے پیش آئے جنہوں نے اس ملک کو اس نعمت سے محروم کر دیا، اور یہ المیہ پیش آیا نہ صرف مغرب کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے، ایک تو یہ کہ اس خطۂ زمین کو عیسائیت ملی۔ اس میں ہم مسلمانوں کی بڑی کوتاہی ہے اور ہم اس کا جتنا بھی ماتم کریں وہ بالکل حق بجانب ہے کہ اس ملک کے لئے اس خطۂ زمین کے لئے مناسب ترین مذہب اسلام تھا جو انسانی قوتوں کو بیدار کرتا ہے، جو عقل انسانی کی ہمت افزائی کرتا ہے، جو عقل سے کام لینا سکھاتا ہے، جو انسان میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے، اپنی عزت کا احساس پیدا کرتا ہے، وہ کہتا ہے "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" ہم نے انسان کو بہترین انداز میں پیدا کیا۔ وہ کہتا ہے "ولقد کرمنا بنی آدم وحملناهم فی البر والبحر ورزقناهم من الطیبٰت" (بنی اسرائیل) وہ کہتا ہے کہ ہم نے انسان کو بڑا اعزاز بخشا، ہم نے اس کا بڑا رتبہ بلند کیا ہم نے اس کو زمین اور آسمانی طاقتوں کا راکب بنایا، شہسوار بنایا، اور ہم نے اس کو بڑی نعمتیں عطا کیں، اکثر مخلوقات پر فضیلت بخشی وہ کہتا ہے: "انی جاعل فی الارض خلیفة" میں زمین میں انسان کو خلیفہ بنانے والا ہوں، وہ انسان کے سر پر خلافت کا تاج رکھتا ہے جو آخری چیز ہو سکتی ہے۔ اسلام کی بنیاد توحید پر ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ انسان خلیفۃ اللہ ہے، اس دنیا میں خدا کا نائب ہے، اور پھر انسان کا مرتبہ اتنا بڑھایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے آگے انسانیت کی بلندی کا تصور نہیں ہو سکتا چنانچہ ایک حدیث قدسی ہے کہ خدا تعالیٰ انسان سے کہے گا کہ اے انسان میں بیمار ہوا تھا تو مجھے دیکھنے نہیں آیا تو وہ کہے گا کہ اے بار خدایا آپ کو بیماری سے کیا مطلب آپ ان سب چیزوں سے بالاتر ہیں تو ارشاد ہوگا کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا اگر تو اس کی عیادت کے لئے جاتا تو مجھے وہیں پاتا، اے میرے بندے میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا تو وہ کہے گا کہ آپ کو بھوک سے کیا نسبت اور اس سے آپ کا کیا واسطہ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا فلاں بندہ بھوکا تھا تو اگر اس کو کھلاتا تو مجھے پہونچتا۔

اے میرے بندے میں برہنہ تھا تو نے مجھے کپڑے نہیں پہنائے تو وہ کہے گا آپ کیا کہہ رہے ہیں ارشاد ہوگا کہ میرا فلاں بندہ برہنہ تھا اگر تو اس کو کپڑے پہناتا تو مجھے پہونچتے۔

اس سے بڑھ کر انسانیت کو اعزاز نہیں بخشا جا سکتا اور اس سے بلند تصور نہیں کیا جا سکتا اور پھر اسلام یہ بتاتا ہے انسان پیدائشی طور پر بے گناہ ہے، اس کی فطرت صالح ہے اس کی تختی بالکل سادہ ہے۔ "کل مولود یولد علی الفطرة فابواه یهودانه وینصرانه ویمجسانه" ہر بچہ ماں کے پیٹ سے بالکل معصوم بے گناہ پیدا ہوتا ہے، فطرت صحیح پر پیدا ہوتا ہے، اس کے ماں باپ کا یہ کارنامہ ہے کہ کبھی اس کو یہودی بنا دیتے ہیں، کبھی عیسائی بنا دیتے ہیں اور کبھی مجوسی، اس پر اپنا رنگ چڑھاتے ہیں۔ لیکن انسان جو پیدا ہوتا ہے وہ صبغۃ اللہ، خدا کا رنگ لے کر آتا ہے، اور اسلام یہ بتاتا ہے کہ انسان کی اصل جوہر ہے وہ طاعت ہے انسان کی فطرت میں سلامتی رکھی ہوئی ہے اگر اس کو فطرت پر چھوڑ دیا جائے جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ بعض بعض کھلونے ہوتے ہیں اگر آپ ان کو چھوڑ دیں تو وہ الٹ جائیں اور ہر چیز اپنے مرکز کی طرف جاتی ہے تو انسان اپنی ذات سے صحیح راستہ اختیار کرتا ہے یعنی اس کی فطرت صحیح رہنمائی کرتی ہے اس کی فطرت میں کسی قسم کا ٹیڑھا پن یا کجی نہیں ہے چنانچہ آپ دیکھتے چلیں کہ قرآن میں آتا ہے اور بہت کم لوگوں کو غور کرنے کا اتفاق ہوا ہو، "لها ما کسبت وعلیها ما اکتسبت" یعنی انسان کے لئے وہ چیز مفید ہے جو اس نے کمائی، اور انسان کے لئے نفس انسانی کے لئے وہ چیز مضر ہے جو اس نے بہ تکلف کمائی، یعنی انسان کو نیک کام کرنے کے لئے کسی تکلف کی ضرورت نہیں اس کو اپنی فطرت سے لڑائی لڑنے کی ضرورت نہیں۔ "لها ما کسبت" میں "کسبت" یہ مجرد کے صیغہ سے آیا ہے اور "اکتسبت" مزید فیہ کے صیغہ سے آیا ہے اس میں تکلف شامل ہے باب افتعال سے یعنی جو اس نے اچھا کام کیا خدا کی مرضی کے مطابق تو اس کی عین فطرت کے موافق تھا اور جو اس نے غلط راستہ اختیار کیا تو وہ فطرت کے خلاف تھا، اس کو اپنی فطرت سے لڑائی لڑنی پڑی، اپنی فطرت سے انحراف کرنا پڑا، اس کو ایک مجاہدے کا کام کرنا پڑا، اس سے بڑھ کر انسانی فطرت کے متعلق کیا سند ہو سکتی ہے کہ جو انسان کا صحیح کام ہو وہ اس کی فطرت کا تقاضا اور جو غلط کام کیا تو گویا اس نے اپنی فطرت سے بغاوت کی۔

تو اس ملک کے لئے مناسب ترین مذہب اسلام تھا، اگر اس ملک کا اور اسلام کا سنجوگ ہو جاتا یعنی ایک جائز رشتہ قائم ہو جاتا تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی، ایک طرف اس خطۂ زمین کے لوگوں کی توانائی، ابلتی ہوئی طاقتیں جو جوش مارتی ہیں جس طرح فوارہ ابلتا ہے ان کے اندر کام کرنے کی لامحدود طاقت، ان کو کسی چیز پر چین نہیں ہے، یہ ستاروں تک پہونچنے کی کوشش کر رہے ہیں، سمندر کھنگال کر اس سے موتی نکالنا چاہتے ہیں، سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں، مٹی سے سونا برآمد کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے بے جان چیزوں میں جو جان ڈال دی ہے، ایک طرف ان کی توانائیاں، ان کی بے چین فطرت، ان کے ملک کی شادابی، اور قدرتی دولتوں اور اسلام کی راہ اعتدال، اسلام کی حوصلہ افزائی، اسلام کا دین فطرت ہونا، اسلام کا ایسا خود اعتماد پیدا کرنا کہ انسان اپنی ذات سے بے گناہ ہے وہ ماں کے پیٹ سے بالکل بے گناہ پیدا ہوتا ہے، اور اگر وہ گناہ کرتا ہے تو وہ ایک عارضی چیز ہوتی ہے جیسے ہی وہ توبہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ زنگ جو اس پر لگ گیا ہے وہ نکل جاتا ہے، توبہ کوئی مجبوری کی چیز نہیں بلکہ وہ عین اس کی فطرت کا تقاضا ہے اندر سے وہ چیز ابھرتی ہے باہر سے نہیں آتی اس لئے توبہ کرنے والوں کا بڑا احترام بتایا گیا ہے تو اسلام جو انسانی قوت میں اضافہ کرتا ہے، انسان کی ہمت افزائی کرتا ہے اور انسانی قوت کو ابھارتا ہے وہ دین توحید ہے اس میں کہیں تخیلات پروری نہیں ہے وہ حقائق پر مبنی ہے، وہ ایسا عام فہم اور بدیہی مذہب ہے جس کو ہر سلیم الفطرت انسان سمجھ جاتا ہے، وہ انسانی زندگی کو بیڑیاں نہیں پہناتا کہ انسانی زندگی مقید ہو کر رہ جائے وہ علم کی راہ نہیں روکتا بلکہ علم کو ایک مقدس عبادت قرار دیتا ہے وہ انسان کو دعوت دیتا ہے "وفی انفسکم افلا تبصرون" وہ کہتا ہے "الذین یتفکرون فی خلق السموٰت والارض ربنا ما خلقت هٰذا باطلا" اور "سنریهم آیاتنا فی الآفاق" وہ انسان کو دعوت فکر دیتا ہے وہ انسان کو عقل سے کام لینے کو کہتا ہے، وہ کہتا ہے "الذین اذا ذکروا بآیات ربهم لم یخروا علیها صما وعمیانا" جس کا میں نے ذکر کیا، اس کی ساخت ایسی ہے اور ایک طرف یہ ملک جو طاقتوں سے بھرا ہوا ہے تو اگر وہ ایک دوسرے کا تعاون کرتے تو دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا لیکن بد قسمتی ہے صرف اس ملک کی ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی نوع انسانی کی اور خاص طور پر ہمارے اس دور کی، اس ملک نے جس مذہب کا انتخاب کیا وہ اس ملک کو بتاتا ہے انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے، وہ انسان کے اندر گناہ کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ایک قسم کی مایوسی کہ یہ اس کی قسمت ہے اور قسمت بدلی نہیں جا سکتی یعنی اس کا یہ جنم کا روگ ہے، وہ جنم کا گناہ گار ہے ایک

تو یہ ہوتا ہے کہ اس سے غلطی ہو جائے اور وہ سمجھے غلطی ہوئی اور اس کی وہ تلافی کر دے لیکن انسان کے اندر یہ عقیدہ بٹھا دیا جائے کہ انسان پیدائشی طور پر گنہگار ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا احساس کمتری میں پیدا ہوگا۔ تو ایک تو بدقسمتی یہ تھی کہ اس ملک نے جس مذہب کا انتخاب کیا وہ مذہب اس کی انسانیت کا اعتراف نہیں کرتا بلکہ اس کی انسانیت پر دھبہ لگاتا ہے اور داغدار بنا کر پیش کرتا ہے، اور پھر اس کو ایک خارجی مدد چاہیے یعنی جو اس کا کفارہ بن کر اس کے گناہوں کو معاف کروائے، پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد اس میں رہبانیت اور ترک دنیا کا رجحان پیدا ہو گیا۔

کلیسا نے علم و عقل کی راہ روکی:

دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ جب کلیسا صاحب اقتدار تھا تو کلیسا نے علم و عقل کی راہ روکی، جب یورپ بیدار ہو رہا تھا اور وہ یہ زنجیریں توڑ رہا تھا تو کلیسا ایک دیوار بن کر کھڑا ہو گیا اس نے ہر چیز کو اپنے فیتے سے ناپنا شروع کیا اور ہر چیز کی سند بائبل سے تلاش کرنا شروع کی، اس نے زمین کی کرویت کا خیال پیش کیا تو کلیسا نے اس کی مخالفت کی، اس نے تعدد عوالم کا نظریہ پیش کیا کہ یہی دنیا نہیں بلکہ اور دنیائیں بھی ہیں تو کلیسا نے اس کو کفر قرار دیا، ارتداد قرار دیا، اس نے بتایا کہ زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے تو کلیسا نے فتویٰ لگایا پھر کلیسا نے عدالتیں قائم کیں اور جو لوگ اس کا نشانہ بنے گزشتہ جنگ عظیم کے مقتولین سے کسی طرح ان کی تعداد کم نہیں بتائی گئی، یہ دو چیزیں ایسی جمع ہو گئیں کہ جس سے اس ملک کا رخ بالکل مادیات کی طرف ہو گیا، ایک طرف اس کے اندر ایک مذہب سے نہیں بلکہ مطلق مذہب کی طرف سے بے اعتمادی اور ایک طرح کی رقابت، کینہ اور انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا، دوسرے اس نے یہ سمجھا کہ علم میں اس وقت تک ترقی نہیں ہو سکتی جب تک مذہب کی بیڑی کو کاٹ کر پھینکا نہ جائے اور کلیسا سے آزادی حاصل نہیں کر لی جائے چنانچہ اس نے کلیسا سے بغاوت کی اور اس کے بعد اس نے یہ مادی سفر شروع کیا جس کے نتائج آج آپ کے سامنے ہیں۔

حضرات! یہ داستان طویل بھی ہے اور بڑی دردناک بھی، دل پر پتھر رکھے بغیر نہ سنائی جا سکتی ہے اور نہ سنی جا سکتی ہے، تاریخ آپ کے سامنے ہے، آپ سب اہل علم ہیں، آپ کا وسیع مطالعہ ہے، آپ تاریخ کے بھی طالب علم ہوں گے، اور تاریخ کے بہت سے فضلاء اور اسکالر یہاں ہوں گے، میں اس وقت یہ گفتگو ایسی یونیورسٹی کے دیوار کے سایہ میں کہہ رہا ہوں جو دنیا میں شہرت رکھتی ہے اور اس کا بہت بلند مقام ہے اس لئے مجھے تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔

مغربی تہذیب نے اپنا عمل پورا کر لیا ہے:

مغرب کی مادی تہذیب کلائمکس نقطۂ عروج پر پہونچ گئی ہے، کائنات کے مضمرات کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اس لئے ہم کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اس کے بعد کوئی جہاں نہیں ہے

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

لیکن اس وقت یہ تہذیب اپنے جو بہترین پھل لا سکتی تھی اور جو بہترین نتائج دنیا کے سامنے پیش کر سکتی تھی، اور آخری کامیابی جو دکھا سکتی تھی وہ اس نے دنیا کو دکھا دی ہے۔ اور اس وقت ہم ایک ایسے موڑ پر آ کر کھڑے ہو گئے ہیں کہ تہذیب نے تقریباً اپنا عمل پورا کر لیا ہے اور امریکہ جو اس تہذیب کا بڑا مرکز ہے وہ اس وقت اپنی ان ترقیات کے جھولے میں جھولا جھول رہا ہے اور وہ فخر سے یہ کہہ سکتا ہے اور کہنے والے کہہ بھی رہے ہیں کہ ہم نے قدرت کو بالکل عریاں کر دیا ہے، ہم نے قدرت کے چہرے کا ہر نقاب اٹھا دیا ہے، ہم نے کوئی راز راز نہیں رکھا ہر راز کو فاش کر دیا ہے اور اس کے نتیجہ میں جو ہونا چاہئے وہ اس وقت حاصل ہے، اس وقت فاصلے سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ اور انسان کو جو آسانیاں میسر آ سکتی تھیں وہ حاصل ہو گئیں اب اس کو کوئی دشواری نہیں، اب کسی تکلیف کی ضرورت نہیں، اب وہ تکلیف کا مزہ خود چکھنا چاہے تو چکھ سکتا ہے لیکن وہ تکلیف اٹھانے پر مجبور نہیں۔ لیکن اس کے باوجود انسان کو نہ سکون حاصل ہے اور نہ دنیا میں امن و امان قائم ہے اور نہ انسان کے قلب و روح کو کوئی غذا مل رہی ہے، انسان ایسے مقام پر پہونچ گیا ہے جہاں وہ بالکل مبہوت ہو کر کھڑا ہو گیا ہے، زندگی اس کو بے مقصد معلوم ہوتی ہے، چیزیں موجود ہیں لیکن ان کا جو اصلی مزہ ہوتا ہے وہ حاصل نہیں ہو رہا، اس وقت تو ضرورت اس کی تھی کہ خود اس ملک میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو اس ملک کو اس دلدل سے نکالیں جس میں وہ پھنس گیا ہے اور اس ملک کو ایک نیا پیغام دیں، اس ملک میں ایک نئی زندگی پیدا کریں لیکن افسوس ہے کہ اب زندگی اس رفتار سے جا رہی ہے کہ اس کی باگ اب انسان کے ہاتھ میں نہیں رہی اب انسان زندگی پر سوار نہیں بلکہ زندگی اس پر سوار ہے، اب یہ سوال نہیں بلکہ مرکب بنکر رہ گیا ہے، اب یہ مشکوک تہذیب سرپٹ لئے جا رہی ہے، منزل نامعلوم، باگ ڈور ہاتھ میں نہیں، پاؤں رکاب میں نہیں، انسان کے سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جا کر یہ سفر ختم ہوگا اور اب وہ مجبور ہو کر عامل نہیں معمول بنا ہوا ہے۔ تو اس موقع پر امید تو یہ تھی اور ہم ایشیا کے لوگ جن میں فلسفی بھی ہیں اور دوسرے بھی آنکھیں لگائے ہوئے تھے کہ مغرب ہی میں نیا رخ پیدا ہوگا جو اس تہذیب کو نیا رخ دیگا اور زندگی کی اس ترقی کو بامعنی اور بامقصد بنائے گا لیکن ایسی شکل پیدا نہیں ہوئی۔

امید کی ایک نئی کرن:

میں اس کو محض اتفاق نہیں کہتا، میں اتفاقات کی منطق کا قائل نہیں میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پیچھے تقدیر الٰہی کام کرتی ہے "ذٰلک تقدیر العزیز العلیم" خدا نے آپ کو اس ملک میں پہونچا دیا ہے بڑی تعداد میں مسلمان یہاں پہونچ گئے ہیں، اور صرف ہاتھ سے کام کرنے والے نہیں بلکہ دماغی صلاحیت رکھنے والے مسلمان بھی ہیں، جو یونیورسٹیوں میں تعلیم پا رہے ہیں تحقیقات میں مصروف ہیں، بہت سے ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے علم کا یہاں لوہا منوا لیا ہے وہ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، محقق بھی ہیں، تو خدا نے اس وقت ایک موقع دیا ہے کہ بہت سے مسلم ممالک کے ذہین نوجوان یہاں پہونچ رہے ہیں، اور خود یہاں کی آبادی میں بھی اسلام پھیل رہا ہے، اور ایک بڑی تعداد ایسی موجود ہے جو یا تو اسلام قبول کر چکی ہے یا قبول کرنے کے لئے تیار ہے اور ہمارے بلالی مسلمان اس وقت ہمارے لئے بہت بڑی طاقت کا سرچشمہ ہیں اور ہماری امیدوں کا مرکز ہیں، اس طرح یہ ملک ایک نئی کروٹ لے رہا ہے اور امید کی ایک نئی کرن پیدا ہو رہی ہے، وہ جو وقت تھا ہمارے لئے کہ ہم اس ملک کی دستگیری کرتے وہ ہمارے آپسی اختلافات کی وجہ سے اور ہماری کوتاہ بینی سے وہ وقت نکل گیا، چاہئے تو یہ تھا کہ جس وقت ترکوں کو اقتدار حاصل ہوا تھا، اور مضبوط حکومت قائم ہوئی تھی یا اس سے قبل جب اسپین میں مسلمانوں کی حکومت قائم تھی اس وقت یورپ میں اسلام کی اشاعت ہوتی تو مغرب بھی اس ورطہ میں نہ پڑتا، اس مادیت کے دلدل میں نہ پھنستا اور نہ اس کی وجہ سے وہ قومیں بھی پھنستیں جو یورپ کی متعلقہ ہیں۔

اس کا بہترین وقت وہ تھا جب اسپین میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی اور پھر اس کے بعد دوسرا وقت وہ تھا جب عثمانی خلافت قائم ہوئی، لیکن افسوس کہ ہم نے اس وقت سے کام نہ لیا، اس سے بھی پہلے جب اسلام کے داعی دنیا میں نکلے تھے کاش کہ اس وقت یہ داعی یہاں پہونچ جاتے کہا جاتا ہے کہ امریکا کا کولمبس سے پہلے مسلمانوں نے انکشاف کیا تھا کاش وہ ایک نئی دنیا کا انکشاف کرتے اور اس ملک کو ایک نیا پیغام دیتے اور وہ پیغام اسلام ہوتا لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہو سکا جس کا نتیجہ سزا کے طور پر آج اسلامی ممالک بھگت رہے ہیں آج اسلامی ممالک یورپ کی جس غلامی میں مبتلا ہیں اور جس طرح وہ یورپ کے دریوزہ گر بن گئے ہیں، اور مغرب کے ارادوں کے جس طرح وہ تابع ہو گئے ہیں، مغرب جو معاملہ کر رہا ہے اور جو کھیل کھیل رہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ سزا ہے مسلمانوں کی اس کوتاہی کا کہ مسلمانوں نے وقت پر اس کو خدا کا پیغام نہیں سنایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے آشنا نہیں بنایا۔

لیکن اب خدا نے ایک موقع دیا ہے، آپ مختلف ملکوں سے، مختلف تقریبوں سے، مختلف اغراض سے تیزی کے ساتھ اس ملک میں آ رہے ہیں، کوئی اسلامی ملک نہیں جس کے بہترین نوجوان یہاں نہیں نظر آتے ہوں، اور آخری بات یہ ہے کہ اس ملک سے جہاں حرم واقع ہے اس سے بھی بڑی تعداد میں نوجوان

یہاں آ رہے ہیں اس وقت آپ حضرات اپنی ذمہ داری کو سمجھیں اور آپ کی ذمہ داری اتنی ہی نہیں کہ آپ مغرب کے علوم سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے معاشی مسئلہ کو حل کریں یا آپ یہاں سے بڑی دولت کما کر لے جائیں اور اپنے کنبہ اور خاندان کو فائدہ پہونچائیں آپ کو اپنی ذمہ داری یہ سمجھنی چاہئے کہ اس ملک میں جس چیز کی کمی ہے اور یہ ملک اپنی تمام دولتوں کے باوجود جس دولت کے بارے میں بالکل محتاج ہے اور خدا کا فرمانا "ثم رددناہ اسفل سافلین" اگر آپ اس کی مادی فتوحات دیکھئے! اگر آپ اس کی سائنسی ترقیات دیکھئے تو "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" اور اگر آپ اس کی اخلاقی افلاس دیکھئے، اگر آپ اس کی روحانی پیاس دیکھئے! اگر آپ اس کی روح کا کرب دیکھئے، ایک طرف آپ اس کی عقلی پختگی اور رسائی تو ساتھ اس کے عقلی بچپن اور طفولیت دیکھئے دونوں چیزیں اس میں جمع ہیں ایک طرف چاند پر جا رہا ہے اور ایک طرف "ثم رددناہ اسفل سافلین" یہ اخلاقی پستی کے آخری گڑھے میں گر رہا ہے وہی امریکہ کہ جس نے آج ہر مسئلہ کو حل کر دیا ہے وہی آج اپنے نوجوانوں کے اخلاقی مسئلے کو حل کرنے میں ناکام ہے۔ اقبال نے کہا تھا ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
وہ جس نے ستاروں کی گذرگاہیں دریافت کیں

جو چاند پر پہونچا وہ اپنی زندگی میں چاندنی اور روشنی نہ لا سکا۔

میں بالکل صفائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ کاش ہمارا کوئی اسلامی ملک اس پوزیشن میں ہوتا کہ وہ مغرب کو پیغام دیتا اور مغرب سے آنکھیں ملا کر یہ کہتا تو نے یہ غلطی کی، اے مغرب! تو نے یہ ٹھوکر کھائی، اے مغرب! تیرے درد کی دوا ہمارے پاس ہے تیرے درد کی دوا ہمارے قرآن میں ہے، رسول اللہ ﷺ کے پیغام میں ہے، لیکن میں آپ سے صاف کہتا ہوں ہماری گردنیں ندامت اور شرم سے جھک جاتی ہیں کہ سعودی عرب سے لے کر پاکستان تک اور مراکش سے لیکر انڈونیشیا تک کوئی ملک اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ اس ملک سے آنکھ ملا کر خود اعتمادی سے کچھ کہہ سکے، یہ واقعہ ہے کہ ہم نے اپنے کو اس پوزیشن میں ہی نہیں رکھا ہے کہ ہم مغرب سے شریفوں کی طرح بات کر سکیں، مردوں کی طرح بات کر سکیں، ہم جب مغرب سے بات کرتے ہیں تو سر سے لے کر پاؤں تک ہم اس کے احسانات میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، ہماری جہالت ہمارے خلاف گواہی دیتی ہے، ہمارا افلاس ہمارے سر کے اوپر چڑھ کر بولتا ہے، ہم جب بولتے ہیں تو ان کی زبان میں بولنا چاہتے ہیں اپنی زبان میں بولنا بھی پسند نہیں کرتے، ہمارے جسم پر ان کا لباس ہوتا ہے اور بھیک کے لئے ہاتھ پھیلا ہوتا ہے ایسی حالت میں کونسا اسلامی ملک اس مغرب سے جو کہ اقتدار کا مالک ہے جس کو ہر طرح کی سیادت حاصل ہے، علمی سیادت، سیاسی سیادت، اقتصادی سیادت اس کو حاصل ہے کون سا ایسا ملک ہے جو اس مغرب پر ادنیٰ تنقید کر سکے۔ اس مغرب کو کوئی نقد دے سکے کوئی مشورہ دے سکے، کوئی اسلامی ملک اس شان میں نہیں۔

آپ داعی کا مقام رکھتے ہیں:

لیکن میں آپ سے کہتا ہوں ممکن ہے کہ یہ میری تخیل آرائی ہو۔ ممکن ہے میری بلند پروازی ہو، میں آپ سے ضرور کہوں گا اور آپ کو اس کا اہل سمجھتا ہوں کہ کہوں کہ آپ اپنی زندگی، اپنے وجود، اپنے طرز زندگی سے یہ ثابت کریں کہ آپ کے پاس اس مغرب کو دینے کے لئے کچھ ہے آپ یہاں صرف لینے کے لئے نہیں آئے ہیں بلکہ دینے کے قابل بھی ہیں آپ کا ہاتھ صرف لینے کے لئے نہیں پھیلا ہوا ہے بلکہ وہ کچھ دینے کے لئے بھی پھیل سکتا ہے، آپ اگر یونیورسٹی کے طالب علم، لیکچرار یا ریسرچ اسکالر ہیں یہاں تک کہ آپ یہاں کی کسی فرم میں ہیں، آپ کا جن سے سابقہ پڑتا ہے آپ کے ساتھ جو کام کرنے والے ہیں ان سب کے سامنے آپ اسلام کی صداقت کو پیش کر سکتے ہیں ان میں یہ احساس پیدا کر سکتے ہیں کہ اسلام آج بھی ان کی مدد کر سکتا ہے، کچھ دے سکتا ہے ان کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود گویا کچھ نہیں اور ان سے جو حقیقی فائدہ پہونچنا چاہئے تھا ان علمی تحقیقات سے اور مادی فتوحات سے وہ ان کو نہیں پہونچ رہا ہے، آپ کو اس مقام پر ہونا چاہئے آپ کے اندر یہ اعتماد بحال ہونا چاہئے کہ آپ داعی کا مقام رکھتے ہیں، آپ صرف خوشہ چیں نہیں ہیں کہ یہاں آ کر ان کی کلیاں توڑیں اور اپنا دامن بھریں بلکہ آپ اپنی کلیوں سے ان کا دامن بھر سکتے ہیں، یہ بات موجودہ حالات کے لحاظ سے قبل از وقت اور ناقابل قیاس ہے اور شاید ہمارے بہت سے بھائی تعجب کریں کہ میں یہ سب باتیں کہاں سے کہہ رہا ہوں، میں کہاں رہتا ہوں، لیکن قرآن اور اسوۂ نبوی ہمارے اندر اعتماد پیدا کرتا ہے جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کھانے کو نہیں تھا اور مدینہ میں کوئی اسٹیٹ قائم نہیں ہوئی تھی اور جب کہ کوئی معاشی مسئلہ بھی حل نہیں ہوا تھا، اور مسلمان خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تھے اس وقت خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قیصر روم کو جو اس وقت سمبول تھا دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا اور جو دنیا کے آدھے حصہ پر حکومت کرتا تھا، اپنے خط میں لکھا تھا:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم / من محمد عبداللہ ورسولہ الی ھرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الھدیٰ اما بعد! فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یؤتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فان علیک اثم الاریسیین ویا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون!

(بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمد کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے اس کو سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں، اسلام لا تو سلامت رہے گا خدا تجھ کو دگنا اجر دے گا اور اگر تو نے نہ مانا تو اہل ملک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا۔ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو (خدا کو چھوڑ کر) خدا نہ بنائے اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔)

ہم اس پیغمبر کے امتی ہیں جس نے فقر و فاقہ کی حالت میں، گمنامی کی حالت میں اس وقت جب کہ دنیا میں ان کی سیاسی، اقتصادی کوئی پوزیشن نہیں تھی، اس حالت میں اسلام کی دعوت، دنیا کے سب سے باجبروت انسان کو اس خود اعتمادی کے ساتھ دی، یہ کیا ہمت تھی؟ یہ کیا مقام تھا، یہ کیا بلندی تھی اس وقت جب کہ ان کے گھر میں کھانے کو نہیں، اس کے گرد اسے [illegible] چند لوگ ان کے ماننے والے ہیں، اور ایک شاہ وقت سے وہ اس طرح کہتا ہے کہ "اسلم تسلم" اسلام قبول کرو بچ جاؤ گے، تمہاری حفاظت ہوگی، تمہاری جان بچ جائے گی، ہم اس پیغمبر کے امتی ہیں، آج ہمارا مقام یہ ہونا چاہئے کہ ہم آج اس قوم کو دینے کا حوصلہ رکھیں اور ان کو یہ احساس دلائیں کہ ہمارے پاس وہ دولت ہے جس سے وہ محروم ہے اور بغیر اس دولت کے یہ تمدن بچنے والا نہیں، اس وقت یہ تمدن خودکشی کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہے اور اس گہری خندق میں چھلانگ لگانے کے لئے تیار ہے جس میں گرنے کے بعد کبھی ابھر نہیں سکے گا، اسے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو یہی خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات، قرآن کی رہنمائی اور یہ کہ مادیات اور اخلاقیات اور وسائل و مقاصد کے درمیان رابطہ قائم کیا جائے اگر مادیات ہیں اور اخلاقیات نہیں تو تباہی کے سوا کچھ نہیں یہ وہ پیغام ہے جو ہمارے اسلامی ملکوں کو دینا چاہئے تھا اور میں نام لے لے کر کہہ سکتا ہوں یہ پیغام شاہ خالد کو دینا چاہئے تھا، یہ ذوالفقار علی بھٹو کو دینا چاہئے تھا، یہ انڈونیشیا کے ملک سوہارتو کو دینا چاہئے تھا، یہ شاہ حسن کو دینا چاہئے تھا، یہ شاہ حسین کو دینا چاہئے تھا، کہ اے مغرب تو ڈوب رہا ہے، ہم تجھے بچا سکتے ہیں، لیکن مجھے یہ ہے کہ ان میں سے کوئی یہ پوزیشن نہیں رکھتا، انہوں نے اپنے کو اس قابل رکھا ہی نہیں ہے، یہ مغرب کے دریوزہ گر ہیں، ان میں سے کسی میں ہمت نہیں ہے کہ کچھ کہہ سکیں کہ اے مغرب تیرے تمدن میں کمی ہے، یہ مغربی تہذیب کے مزاج سمجھے ہیں، کسی نے کہا ہے کہ ساری دنیا کا قبلہ حرم ہے اور حرم کا قبلہ امریکہ بنا ہوا ہے، میں کہہ رہا ہوں دین کا ادنیٰ طالب علم، اور اس طبقہ سے تعلق رکھنے والا جس کو ہر حال میں دفاع کرنا چاہئے تھا، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ آج ہمارے اسلامی ملوک، رؤسائے جمہوریات اس قابل نہیں ہیں کہ مغرب کو کچھ پیغام دے سکیں، مغرب کو کچھ مشورہ دے سکیں لیکن آپ اگرچہ آپ کسی ریاست کے مالک نہیں، اگرچہ آپ کسی خزانے کے مالک نہیں لیکن آپ یہ فرض انجام دے سکتے ہیں کس طرح دے سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ ایک زندگی کا مظاہرہ کریں، آپ خود اعتمادی کا مظاہرہ کریں، آپ اپنے دین پر، اپنے مذہب پر فخر کرنا سیکھیں، آپ خدا کی اس نعمت پر شکر ادا کریں کہ قدرت نے آپ کو ان نعمتوں سے نوازا ہے، آپ نمازوں کے ذریعہ، دعاؤں کے ذریعہ، اس مادیت کے جال سے آزاد ہونے کے ذریعہ آپ یہ ثابت کریں کہ مادیت آپ کو غلام نہیں بنا سکتی ہے ابھی آپ کی روح زندہ ہے، ابھی آپ کا قلب زندہ ہے ان کی طرح مردہ نہیں ہوا، ابھی آپ کے اندر خیر و شر کے فرق کا احساس زندہ ہے، آپ کے نزدیک دنیا کی دولت ہی کا سب کچھ نہیں ہے بلکہ آپ کے نزدیک یہ دنیا ہی کچھ نہیں ہے اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے اور آپ خدا کو قادر مطلق سمجھتے ہیں اور اس کی رضا کو سب سے بڑی سعادت اور کمال سمجھتے ہیں، خدا نے آپ کو یہ موقع دیا ہے خدا نے آپ کو اسی لئے بھیجا ہے کہ آپ ان کے سامنے زندگی کا نیا تجربہ اور نئی حقیقتیں لائیں جو ان کی آنکھوں سے بالکل اوجھل ہو گئی ہیں، اور مسیحیت اپنی ان تمام کلیساؤں کے باوجود ڈیوینٹی کالجوں کے باوجود اور عیسائیت کو جو اقتدار حاصل ہے اس کے باوجود مسیحیت اس حقیقت کو زندہ کرنے میں ناکام رہی ہے اور آئندہ بھی اس سے کوئی امید نہیں ہے، آپ اپنی ہر طرح کی کمزوریوں کے باوجود یہ فرض انجام دے سکتے ہیں [illegible]

بڑھاپے کے مجرم

یہ کہانی یورپ اور امریکہ کی ان اقامت گاہوں کی عکاسی کرتی ہے جہاں مہذب اور اعلیٰ تعلیمیافتہ اقوام ماں باپ کو صرف اس خیال سے چھوڑ آتی ہیں کہ گھروں میں ان کا وجود فیشن کے خلاف لگتا ہے، یہ اقامت گاہیں صاف ستھری ہیں، یہاں عورتوں اور مردوں کو اچھے سے اچھا کھانا ملتا ہے اور اس کے بدلے میں کوئی کام کرنا نہیں پڑتا، کبھی کبھار ان کے عزیز و اقارب ان سے ملنے بھی آتے ہیں اور دور دراز شہروں میں رہنے والے لائق بیٹے ہر کرسمس پر تحفے تحائف بھی بھیجتے ہیں لیکن کیا انسان کی ضرورت صرف اچھا کھانا اور اچھا کپڑا ہے۔ اس کا جواب روتی، بسورتی، جلتی، کڑھتی، تڑپتی اور گھائل خواتین دے رہی ہیں، جنھوں نے اپنی کوکھ سے چاند تک پہنچنے والے انسان کو جنم دیا، لیکن جو روشن گھروں میں رہ کر بھی روشنی اور انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی انسانیت کے لئے ترس رہی ہیں۔ انجیلو نا کارل کی اس حقیقت پسندانہ کہانی طلعت بشیر نے اُردو میں منتقل کیا ہے۔

کیک اور بسکٹ ہی کی وجہ سے اینالیزا اور مسز ہیوم کی واقفیت بڑھی۔ مسز ہیوم اتنی خشک عورت تھی کہ صحت گاہ کی سب باتونی خواتین خصوصاً مادام سوگسٹرم اور مس نیلسن اس سے دوستی کا ارادہ ترک کر چکی تھیں، لیکن یہی سرد مزاج عورت اینالیزا سے گھنٹوں باتیں کرتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اینالیزا جوان تھی اور مسز ہیوم کو نوجوان اور زندگی سے بھرپور لوگ بے حد پسند تھے۔ اس کے علاوہ وہ اینالیزا کو جب چاہتی بلا لیتی اور جب چاہتی چلتا کرتی، جب کہ دوسری خواتین کے سامنے رکھ رکھاؤ اور آداب سے کام لینا پڑتا۔ اینالیزا کو دوسری خواتین ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں، لیکن مسز ہیوم کی پُر وقار شخصیت نے اسے بہت متاثر کیا۔

ایک دن کمرے کی صفائی کرتے ہوئے وہ تصویروں کے پاس کھڑی ہو گئی تو مسز ہیوم نے ایک ایک تصویر اٹھا کر اُسے بتانا شروع کیا۔

"یہ میری بڑی بیٹی کی تصویر ہے پیدائش کے دو دن بعد۔ ۔ ۔ اور یہ میرا بیٹا ڈگری لے رہا ہے، آجکل وہ اپسالا یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔"

اینالیزا کے لئے ان تصویروں میں کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن مسز ہیوم کا دل رکھنے کے لئے اس نے سب تصویروں کی خوب تعریفیں کیں، سب سے آخر میں مسز ہیوم نے اسے ایک تصویر دکھاتے ہوئے کہا:۔

"یہ میری بیٹی کا گھر ہے۔" تصویر میں ایک جدید طرز کا شاندار بنگلہ دکھائی دے رہا تھا۔

"اُف، کتنا خوبصورت مکان ہے، آپ یہاں رہنا پسند نہیں کرتیں؟" اینالیزا نے غیر ارادی طور پر کہا۔

"میری بیٹی۔ ۔ ۔" مسز ہیوم نے جلدی سے اپنی غلطی درست کی۔ "ڈاکٹر کا خیال ہے کہ صحت گاہ میں رہنا میری صحت کے لئے مفید ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے تصویر کو دوبارہ اس کی جگہ رکھ دیا اور آرام کرسی پر بیٹھ کر کروشیا چلانے لگی، اس نے درجنوں رومال بنا ڈالے تھے ایک مرتبہ اینالیزا کو تحفۃً دو رومال دیئے اینالیزا اس کے خلوص سے بہت متاثر ہوئی اور شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد مسز ہیوم اکثر رومال بنا کر اسے دیتی۔ یہ الگ بات ہے اینالیزا نے کبھی یہ رومال استعمال نہ کیے کیونکہ مسز ہیوم کی نظر کمزور تھی اور اس کے تیار کردہ رومال بُنائی کے اعتبار سے صاف نہ ہوتے تھے۔

دن گزرتے چلے گئے، حتیٰ کہ کرسمس قریب آگئی۔ مسز ہیوم ان دنوں بہت مسرور دکھائی دیتی اور ہر ایک کو بتاتی: "میں کرسمس پر اپنی بیٹی کے پاس جا رہی ہوں۔ پورا ایک ہفتہ وہاں گزاروں گی۔"

اس نے اپنی ساری چیزیں صفائی اور قرینے سے اکٹھی رکھ لیں تاکہ روانگی کے وقت بوکھلاہٹ نہ ہو۔ تقریباً روزانہ بازار جاتی اور بیٹی اور اس کے بچوں کے لئے چھوٹے موٹے تحائف خرید لاتی۔ اس نے مسز لنڈسٹرم سے جو ایک ماہر باورچن تھی، مزے دار چیزیں پکانے کی بہت سی ترکیبیں لکھوالیں تاکہ اپنے نواسے اور نواسی کو کھلا کر خوش کر سکے، لیکن کرسمس سے ایک ہفتہ پہلے مسز میگنوسن کا فون آیا اور اس کے سارے ارمان دل ہی دل میں رہ گئے۔ اپنی آواز کو خواہ مخواہ مغموم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی بیٹی کہہ رہی تھی:۔

"اماں! مجھے بے حد افسوس ہے، لیکن میں مجبور ہوں۔ میگنوسن کا خیال ہے کہ کرسمس کی چھٹیوں میں پہاڑ پر چلے جائیں تاکہ بچے برفباری سے لطف اندوز ہوں۔ میری دلی خواہش تھی تمہیں بھی ساتھ لے چلتی، لیکن پہاڑ پر تمہارے خون کا دباؤ ٹھیک نہیں رہے گا۔ مجھے اُمید ہے تم کرسمس خوشی سے گزارو گی۔" یہ کہتے ہوئے مسز میگنوسن نے فون بند کرنا چاہا لیکن باربرا نے ریسیور ماں کے ہاتھ سے چھین لیا اور بولی:۔

"نانی اماں، کرسمس پر مجھے سونے جاگنے والی گڑیا دیجئے گا۔"

مسز ہیوم کچھ کہنا چاہتی تھی کہ فون بند کر دیا گیا۔

شکستہ دل کے ساتھ وہ اپنے کمرے میں واپس آگئی اور کھانے کی ترکیبوں والے کاغذات توڑ مروڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیے۔ کرسمس سے دو روز پہلے اسے اپنی بیٹی کی طرف سے خوبصورت اونی سکارف اور پروفیسر بیٹے کی طرف سے موتیوں کا قیمتی ہار ملا۔ یہ چیزیں پاکر بھی اسے کچھ خوشی نہ ہوئی۔ کرسمس والے دن وہ اتنی پریشان اور تھکی ہوئی دکھائی دیتی تھی کہ اینالیزا نے اسے بلانے کی جرأت نہ کی۔

کچھ دن بعد فالج زدہ مادام سوگسٹرم انتقال کر گئی اور اس کی جگہ مسز ہیلن، ایک جرنیل کی بیوہ نے لے لی۔ اس نے عورتوں کو تاش کھیلنے کے چند نئے طریقے سکھائے، تو سب اس کی طرف متوجہ ہو گئیں اور مسز ہیوم میں معمولی دلچسپی لینی بھی چھوڑ دی۔ مسز ہیوم بیمار تو نہ تھی لیکن چپ چپ سی رہنے لگی۔ بہار کے سہانے دن آنے والے تھے اور سردی بہت کم ہو گئی تھی، لیکن وہ سیر کے لئے باہر نہ گئی۔ کھانا بھی اکثر اپنے کمرے میں منگوا لیتی۔ مسز میگنوسن ابھی تک ملنے آتی تھی، لیکن مسز ہیوم نے [illegible] لباس تبدیل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اکثر اوقات وہ اپنی بیٹی کو آتے دیکھ کر آرام کرسی پر دراز ہو جاتی اور سسٹر برتھا بلانے آتی، تو بہانہ کر دیتی "سسٹر میری بیٹی کو سلام کہہ دیں، مجھے اس وقت نیند آرہی ہے، میں اس سے نہ مل سکوں گی۔" ڈاکٹر جینسن نے بہت کوشش کی مگر مسز ہیوم کی بیماری کا سبب تلاش نہ کر سکا، آخر اس نے سسٹر برتھا کو علیحدگی میں سمجھایا: "مسز ہیوم کو تازہ ہوا اور ہلکی پھلکی ورزش کی ضرورت ہے۔" چنانچہ برتھا نے اینالیزا کی ڈیوٹی لگائی کہ اسے سیر کو لیجایا کرے۔ پہلے پہل تو مسز ہیوم نے انکار کیا، لیکن اینالیزا اور سسٹر برتھا کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ اپریل کی ایک پُرسکون شام دونوں پارک میں پہونچ گئیں اور ایک خالی بنچ دیکھ کر اُس پر بیٹھ گئیں۔ اینالیزا اپنا ایک پُرانا لباس اُدھیڑ کر ٹھیک کرنے لگی اور مسز ہیوم حسب معمول کروشیا بننے لگی بھینی بھینی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے قریب ہی دو بچیاں ریت کے گھروندے بنانے میں مشغول تھیں۔ اچانک ان میں سے ایک ریت کے ڈھیر سے نیچے گر پڑی۔ مسز ہیوم کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا وہ پلک جھپکتے میں بچی کے قریب پہونچ گئی، اُسے اٹھایا اور کروشیے سے بنے ہوئے رومال کو پانی میں بھگو کر اس کے زخمی گھٹنے پر پھیرا۔ بچی کی چیخیں کچھ رکیں، تو مسز ہیوم نے مسکراتے ہوئے اُسے خوب پیار کیا۔ بچی کی ماں اس کے رونے کی آواز سُن کر آئی اور اپنی بیٹی کو صحیح سلامت پایا، تو تشکر آمیز نظروں سے مسز ہیوم کی طرف دیکھا اور بولی:۔

"بیٹی! تم بھی ان کا شکریہ ادا کرو۔" بچی نے اپنا چھوٹا سا مٹی میں اَٹا ہوا ہاتھ مسز ہیوم کے ہاتھ میں دے کر شکریہ ادا کیا، تو مسز ہیوم کی بے چین روح کو ننھے سے ہاتھ کے لمس نے جیسے مطمئن کر دیا اس نے بچی کا ہاتھ گرمجوشی سے تھامے رکھا لیکن ماں بولی۔ "چلو اینی! اب چلیں۔" اور بچی ہاتھ چھڑا کر ماں کے ساتھ چل دی۔ مسز ہیوم کچھ دیر تک انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر بولی:۔

"اینالیزا واپس چلیں۔"

دونوں صحت گاہ میں داخل ہوئیں تو سسٹر برتھا نے استقبال کرنا چاہا، مگر مسز ہیوم کے چہرے پر بیزاری کے آثار دیکھ کر ٹھٹک گئی، مسز ہیوم نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے صرف اتنا کہا:۔

"رات کا کھانا میرے کمرے میں پہونچا دینا۔"

چند منٹ بعد مسز میگنوسن آگئی، وہ بھڑکیلے لباس میں تھی اور اس کے ہیٹ پر کپڑے کے بنے ہوئے نہایت دلکش گلاب کے پھول ٹکے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی پھر مسز ہیوم نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بیٹی سے بولی:۔

"رنگیلڈا! میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"کہو۔"

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ۔ ۔ ۔ کہ۔ ۔ ۔"

مسز ہیوم نے جیسے یکایک فیصلہ کر لیا۔ "بات یہ ہے کہ میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟ یہاں کوئی تکلیف ہے؟" مسز میگنوسن جانتے بوجھتے انجان بن گئی۔

"نہیں تکلیف تو کوئی نہیں، لیکن میں کیا کروں، یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔"

"کیا یہ لوگ تم سے اچھی طرح پیش نہیں آتے؟"

"یہ بات نہیں ہے، خدایا میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔" مسز ہیوم نے بات کو اُدھورا چھوڑ دیا، کیونکہ اُسے خیالات کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"آخر بات کیا ہے؟ یہاں سب لوگ تمہیں

پسند کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جینسن بھی تمہاری طرف سے مطمئن ہے۔"

"ڈاکٹر جینسن!" مسز ہیوم غصیلی آواز میں بولی، "مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں اور نہ میں ہسپتال میں رہنا پسند کرتی ہوں۔"

"یہ ہسپتال نہیں ہے اماں، یہ تو ایک بورڈنگ ہاؤس ہے۔" مسز میگنوسن نے اعتراض کیا۔

"کچھ بھی ہو میں اس طرح زندگی نہیں گزار سکتی، سارا دن بیکار بیٹھی رہتی ہوں، وقت کسی طرح کٹتا ہی نہیں۔"

"لیکن یہاں دوسری عورتیں بھی ہیں لیڈی کیلاس، مس لارسن وغیرہ، ان کے پاس چلی جایا کرو۔"

"وہ بہت اچھی ہیں، لیکن خود ہی سوچو اتنے سارے بوڑھے لوگ ایک جگہ جمع ہو جائیں تو ماحول میں کتنی یکسانیت پیدا ہو جائے گی۔"

"یہ تو قدرتی بات ہے، لیکن میرا خیال ہے عمر رسیدہ لوگوں کو اکٹھے رہنا چاہیئے، کیونکہ ان کی دلچسپیاں اور ان کے خیالات ایک سے ہوتے ہیں، مجھے ہی لو، میں ایگنس اور اس کی سہیلیوں کے پاس نہیں بیٹھتی، کیونکہ میرے اور ان کے خیالات آپس میں نہیں ملتے۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے۔" مسز ہیوم اسکی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن میری خواہش ہے ایسا نہ ہوا کرے۔ نوجوان لوگ اگر بوڑھوں کے ساتھ گھل مل کر رہیں، تو کیا نقصان ہے، ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو، لیکن رنگیلڈا! میں اس ماحول کو برداشت نہیں کر سکتی۔ آجکل تو میں سو بھی نہیں سکتی۔"

"خواب آور گولیاں استعمال کرو اور زیادہ سوچنے کی عادت چھوڑ دو۔ میرا خیال ہے اسی وجہ سے تمہیں نیند نہیں آتی۔"

"نہیں، نہیں، اصل میں سارا دن بیکار رہنے کے سبب طبیعت گھبراتی ہے، میں کام کرنا چاہتی ہوں۔"

"اس عمر میں کام کیسے ہو سکتا ہے اماں، ڈاکٹر جینسن۔ ۔ ۔"

"بھاڑ میں جائے ڈاکٹر جینسن۔" مسز ہیوم چڑ کر بولی۔ "میں اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی ہوں، تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو، میں وعدہ کرتی ہوں تم پر بوجھ نہ بنوں گی۔"

"تم مجھ پر کیسے بوجھ بن سکتی ہو؟" مسز میگنوسن نفرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی، "میں تمہارے فائدے کے لئے اتنی رقم خرچ کر رہی ہوں، گھر آؤ گی تو بچے بہت تنگ کریں گے۔"

"وہ بیچارے بھلا مجھے کیوں تنگ کرنے لگے۔" مسز ہیوم نے ایک سرد آہ بھری۔ "مدت ہو گئی انہیں دیکھے ہوئے۔"

"اماں میں جانتی ہوں تم انہیں بہت پیار کرتی ہو، میں انہیں ساتھ لایا کروں گی۔"

"مجھے تو اسی وقت قرار آئے گا جب میں اُن کے ساتھ رہوں گی۔"

"خدا کے لئے ہوش کی باتیں کرو، اماں ذرا غور کرو میں تمہیں ساتھ لے بھی چلوں، تو سوؤ گی کہاں؟" مسز میگنوسن نے اتنی درشتی سے کہا کہ باہر کھڑکی میں کھڑی ہوئی اینالیزا جو بڑی دیر سے انکی باتیں سُن رہی تھی، کانپ اٹھی۔ "گھر میں صرف پانچ تو کمرے ہیں پہلے تو تم ہال کمرے میں سو جایا کرتی تھیں لیکن اب ایگنس گھر آنے والی ہے، ہال کمرہ اُس کے پاس رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" مسز ہیوم ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "سیڑھیوں کے نیچے جو کمرہ ہے وہ مجھے دے دینا۔"

"لیکن وہاں میری ملازمہ سوتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" مسز ہیوم اپنی بیٹی کے قریب آتے ہوئے بولی۔ "تم یوں کرو، ملازمہ کو صرف صبح کے لئے رہنے دو، شام کو میں تمہارا سارا کام کر دیا کروں گی۔ اس طرح وہ کمرہ مجھے مل جائیگا۔"

"بچوں والی بات کی ہے تم نے۔" مسز میگنوسن بے حسی سے بولی۔ "تم نوکرانی والا کمرہ نہیں لے سکتیں اس کے ساتھ غسل خانہ نہیں اور پھر آجکل ایسی نوکرانیاں کہاں ملتی ہیں جو سارا دن کام کرنے کے بعد رات کو سونے کے لئے کمرہ نہ مانگیں۔ میں نے تو اپنی نوکرانی کی نازبرداری کے لئے کمرے میں ایک ریڈیو بھی رکھوا دیا ہے، ویسے بھی تم شام کو میرا ہاتھ نہیں بٹا سکتیں۔ میگنوسن کے کاروباری دوست آئے دن چائے یا رات کے کھانے پر مدعو رہتے ہیں۔ نوکرانی کے بغیر اتنے لوگوں کا کھانا پکانا بہت مشکل ہے۔"

"میں۔ ۔ ۔ میں نوکرانی سے زیادہ کام کر سکتی ہوں۔"

"توبہ کرو اماں، ایگنس کیا کہے گی، لوگ کیا کہیں گے، ہم اپنی اماں سے نوکروں کا کام نہیں لے سکتے، توبہ کرو اماں، آخر ہمیں بھی ایک دن بوڑھا ہونا ہے۔"

"میں سمجھ گئی رنگیلڈا!" مسز ہیوم دھیمی آواز میں بولی۔ "میں سب سمجھ گئی۔"

"اچھا اماں میں چلتی ہوں۔" مسز میگنوسن فکر مندی سے گھڑی کی طرف دیکھ کر بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

مسز ہیوم پھر کبھی پارک میں نہ گئی۔ اینالیزا اصرار کرتی، تو صحن میں گھاس کے ایک قطعے پر کرسی ڈلوا کر بیٹھ جاتی۔ اینالیزا ان دنوں ایرک نامی ایک لڑکے کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی اور اکثر شامیں اسی کے ساتھ بسر کرتی تھی اس لئے مسز ہیوم کے پاس بیٹھنے کے لئے اُس کے پاس بھی زیادہ وقت نہ تھا۔

ایک دن صبح سویرے مسز ہیوم کے کمرے میں جھانکا، تو خلاف معمول ٹہلتے ہوئے پایا، کچھ دیر بعد وہ صفائی اور جھاڑ پونچھ کے لئے اندر گئی، تو مسز ہیوم نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا اور اسی طرح ٹہلتی رہی۔ اس کی کتاب اور کروشیا بھی میز پر یونہی پڑے تھے۔ کچھ منٹ کے بعد مسز ہیوم نے اپنے بیگ میں سے ایک خط نکالا اور اینالیزا کو بتایا:۔

"میری پوتی کی منگنی ہو رہی ہے۔"

"مبارک ہو۔" اینالیزا مسکرائی۔

"شکریہ!" مسز ہیوم خط کھولتے ہوئے بولی۔ وہ صبح سے اس خط کو چھٹی مرتبہ پڑھ رہی تھی یہ خط مسز میگنوسن کی طرف سے تھا جو ان دنوں اسپالا میں تھی، لکھا تھا:۔

"پیاری اماں، ایگنس کی اگلے ہفتے منگنی ہو رہی ہے۔ لڑکے کا نام گستاف شینسن ہے اور وہ ایک امیر اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایگنس اسے ایک سال سے جانتی تھی، لیکن میں کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ میری ایگنس اتنے اونچے خاندان میں بیاہی جائے گی۔ ۔ ۔" اتنا پڑھ کر مسز ہیوم رُک گئی اور اپنے جذبات پر قابو نہ پاتے ہوئے بولی،

"تو ایگنس اسے ایک سال سے جانتی تھی اور رنگیلڈا نے بھول کر بھی میرے سامنے ذکر نہ کیا اور ایگنس بھی کتنی طوطا چشم نکلی، میں اسے اتنا پیار کرتی ہوں، لیکن اس نے مجھے بتانے کی زحمت گوارا نہ کی۔"

کچھ دیر وہ ساکت بیٹھی رہی پھر بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنے لگی، جذباتی ہیجان کے سبب اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ "ایگنس کو چاہیے تھا اس لڑکے کو مجھ سے ملواتی۔ اپسالا اتنا دور تو نہیں کہ اسے لے کر میرے پاس نہ آسکے۔ کم از کم اس لڑکے سے میرا تعارف ہی کرا دیتی کہ نانی اماں میں اس لڑکے سے شادی کرنے والی ہوں، مجھے کیا کہنا تھا، وہ لڑکا پسند نہ آتا، تو بھی ایگنس کی خواہش کا احترام کرتی میری سمجھ میں نہیں آتا مجھ سے ہر بات چھپائی کیوں جاتی ہے۔ ۔ ۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور نڈھال سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ خط کو میز پر رکھنے لگی، تو اندر سے ایک تصویر نکل کر فرش پر گر پڑی۔ اینالیزا نے بڑھ کر اُسے اٹھایا۔ تصویر میں ایک لڑکی موسم گرما کا ہلکا پھلکا لباس پہنے ایک نوجوان کے ساتھ کھڑی تھی۔ "کتنی خوبصورت تصویر ہے۔" اینالیزا نے کہا، "میں کل اس کے لئے ایک فریم خرید کر لاؤں گی۔"

"نہیں، مجھے کسی فریم کی ضرورت نہیں۔" مسز ہیوم کے لہجے میں تلخی نمایاں تھی۔ اس نے تصویر کو بے احتیاطی سے میز کی طرف اُچھال دیا، وہ دوبارہ فرش پر گر پڑی۔

دوسرے روز نو بجے کے قریب اینالیزا ڈاکٹر جینسن کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"ڈاکٹر صاحب خیریت تو ہے، آپ اتنی سویرے آرہے ہیں؟"

"مسز ہیوم۔ ۔ ۔" ڈاکٹر پوری بات کئے بغیر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اینالیزا بھاگ کر سسٹر برتھا کے پاس پہنچی: "سسٹر برتھا مسز ہیوم کو کیا ہوا؟"

"انہیں رات کو سانس کی شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ دورہ بہت شدید تھا۔ ابھی ہم ڈاکٹر کو بلا ہی رہے تھے کہ رخصت ہو گئیں۔" سسٹر برتھا یہ کہتے ہوئے مسز ہیوم کے کمرے کی طرف چل دی۔ اینالیزا بھی بوجھل دل کے ساتھ اس کے پیچھے ہولی۔

مسز ہیوم کو اس نے پہلی دفعہ پلنگ پر لیٹے ہوئے دیکھا، سفید بال تکیئے پر بکھرے ہوئے اور ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ کمرے میں ہر چیز معمول کے مطابق پڑی تھی۔ میز پر سیاہ جلد والی کتاب اور کروشیا اپنی مخصوص جگہ ساتھ ساتھ رکھے تھے اور درازوں والی میز کے اوپر تصویریں اسی طرح سجی ہوئی تھیں تصویروں کے وسط میں سب سے نمایاں جگہ ایگنس اور اس کے منگیتر کی تصویر تھی جسے رات مسز ہیوم نے فرش پر گرا دیا تھا۔

جنازے پر مسز ہیوم کا سارا خاندان موجود تھا، مسز میگنوسن، اس کا خاوند اور چھوٹے دونوں بچے، اس کا پروفیسر بیٹا جسے جنازے میں شرکت کے لئے اپنا ایک ضروری لیکچر منسوخ کرنا پڑا تھا۔

تحفظ گائے (اور) ہندوستانی مسلمان

از: الحاج عبد الکریم پاریکھ (ناگپور)

(تحفظ گائے کے سلسلے میں ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس ۱۹ ستمبر ۱۹۸۰ء کو اگرسین بھون ناگپور میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں مولانا الحاج عبد الکریم پاریکھ صاحب کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا، موصوف نے اس کانفرنس میں پون گھنٹہ مفصل تقریر فرمائی جس کا متن ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کانفرنس میں آر۔ ایس۔ ایس کے . . . . سنچالک بالا صاحب دیورس اور بائی کمانڈ کے دیگر ذمہ دار، "گیتا مندر" کے سوامی درشنانند جی، جین مہا منڈل، مقامی ہندو مہا سبھا مارواڑی سوسائٹی کے صدر اور سناتنی دھرم، ویدک دھرم کے سربراہ موجود تھے، نیز پنڈت شیوکرن شرما جھانگانی اور شری گھٹاٹے صاحب کے علاوہ ملک کی گورکشا کمیٹیوں کے نمائندے اور اعلیٰ سرکاری افسران بھی مدعو تھے۔ تحفظ گائے کے مسئلہ میں اس تقریر میں پیش کردہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اور بے لاگ نقطۂ نظر سن کر سامعین نے اعتراف کیا کہ اس مسئلہ میں واقعی پہلو اور صحیح زاویہ نظر اپنانے کی ضرورت ہے)

(بقلم احمد اللہ عقیل مالیگانوی)

★

الحمد للہ وحدہٗ، وانجز وعدہٗ، ونصر عبدہٗ، وھزب الاحزاب وحدہٗ۔

بعد حمد و ثنا کے فرمایا کہ:

مجھے اس کانفرنس میں جو تحفظ گائے کے لئے منعقد کی گئی ہے میرے ہندو بھائیوں نے دعوت کرکے مجھ پر بڑا احسان کیا اور اپنے ایک مسلمان بھائی پر بھروسہ کرکے سب سے پہلے میری تقریر کا اعلان کیا، اس پر اپنے ہندو بھائیوں کے لئے ہم سب کے مالک سے میری دلی دعا ہے کہ اس مسئلہ میں کسی غلط معلومات کے بجائے ہم کو تحفظ گائے کے لئے حقیقی اور صحیح معلومات کی طرف رہنمائی کرے خدا کی مدد اور اس کی ہدایت کے بغیر ہم کسی بات کے صحیح رُخ پر نہیں پہنچ سکتے۔

میرے بھائیو! آج کے جلسے میں "گئو ہتیا" اور "گئو رکھشا" یعنی گائے کشی اور گائے کی حفاظت دونوں باتیں زیر بحث ہیں میں چاہوں گا کہ ہم سب دل کی گہرائی سے اس مسئلے پر سوچ بچار کریں تو پھر ہمیں ماننا پڑیگا کہ "گئو ہتیا" اور "گئو رکھشا" دونوں میں فرق ہے۔ اسلام کا جہاں تک تعلق ہے وہ کسی جانور کے بلا ضرورت قتل کی اجازت نہیں دیتا۔ خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمد صاحبؐ کی حدیث میں چھوٹے پرندوں کے گھونسلوں کو بھی اجاڑنے کی سخت ممانعت ہے یہاں تک کہ پنجروں میں کسی پرندے کو قید رکھنا بھی ناپسند سمجھا گیا ہے اور قرآن نے کسی بھی جان کو ناحق قتل کرنے کو منع کیا ہے۔

گئو ہتیا کے لفظ سے بڑی غلط فہمی ہو جاتی ہے اس لئے میری یہ بڑے ادب کے ساتھ گذارش ہے کہ اس مسئلہ کو تحفظ گائے یا ہندی زبان میں "گئو رکھشا" کہنا مناسب ہے۔ گئو ہتیا کا لفظ ترک کر دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا امید ہے میری اس گزارش کو قبول فرمایا جائے گا۔

تحفظ گائے ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر نہایت ہی ٹھنڈے دماغ اور پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ غور کیا جانا چاہیئے۔ اس مسئلہ کا تعلق صرف مسلم قوم سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہمارے ہندو بھائیوں اور ان کے مذہبی جذبات سے بڑے پیمانہ پر وابستہ ہے اور ملک کی چھوٹی بڑی متعدد اکائیاں بھی اس مسئلے سے متعلق ہیں۔

لیکن جب کبھی گائے کے بارے میں کوئی بات ہوتی تو الزام صرف مسلمانوں پر لگایا جاتا ہے، انجانے میں اور ناواقفیت کی بنا پر جو ہمارے بھائی گائے کے بارے میں صرف مسلمانوں کے بارے میں نفرت پیدا کرنے کا گناہ مول لیتے اور امن پسند سنجیدہ بھائیوں کو غصہ دلاتے ہیں، میرے خیال میں ایسے لوگ ہمارے ملک کی اکثریت کو غلط ڈھنگ سے سوچنے کا عادی بنا دیتے ہیں پھر یہ لوگ گائے کے مسئلے سے اور اسلامی عقیدے سے بھی ناواقف ہونے کی وجہ سے بدامنی کا سبب بنتے ہیں۔

قرآن کی اجازت کے مطابق مسلمان جن جانوروں کا گوشت کھا سکتا ہے اس میں گائے بھی شامل ہے یہ بات بھی واضح کر دینا چاہوں کہ گائے کے گوشت کا استعمال جائز ہے لیکن فرض نہیں کہ ہر مسلمان کو اسے کھانا ہی پڑے گا بلکہ اس کی چھوٹ ہے اور کھانا ہوا کیا ضرورت پر منحصر ہے آج بھی مسلمانوں کے پڑھے لکھے لوگ، مالدار لوگ، ڈاکٹر، وکیل، بیوپاری یا ایسے لوگ جن کا ہاضمہ کمزور ہوتا ہے۔ وہ شاید ہی اس گوشت کا استعمال کرتے ہوں، مگر ہمارے جو غریب بھائی ہیں جن کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں یا جنگلی آدیباسی کم ہیں اپنی ضرورت کے تحت پیٹ بھرنے کے لئے اسلام کی دی ہوئی اس اجازت کا ضرور فائدہ اٹھاتے ہیں اس طرح کے لوگوں کو بھی ان کی ضرورت پر ہمدردی اور دلسوزی سے غور کر کے انھیں آسانی سے منایا اور سمجھایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اس حق کو چھوڑنے پر راضی ہو جائیں، لیکن بہرحال انسانی ہمدردی اور مسئلہ کے حل کے لئے اُن کے نقصان کی بھرپائی کا ہم کو انتظام کرنا ہوگا۔

اس موقعہ پر میں چاہوں گا کہ مسلمانوں کے جذبات واحساسات کو اور ان کے دلوں کو جو تکلیف پہونچتی ہے وہ آپ تک پہونچا دوں کہ جب کبھی گائے کا مسئلہ اٹھایا جاتا ہے سب کو چھوڑ کر صرف مسلمانوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے حالانکہ مسلمانوں سے کئی گنا تعداد میں دوسری قوموں کے کروڑوں لوگ گائے کا گوشت کھانے کھلانے میں بہت بڑے حصہ دار اور شریک ہیں، مثلاً بدھ مذہب کے لوگ، ہمارے ہریجن بھائی، عیسائی مذہب والے، پارسی لوگ ان کے علاوہ جنوبی ہند کے (SOUTH INDIAN) لوگ جس میں ہندو کروڑوں کی تعداد میں گائے کا گوشت کھاتے ہیں، پھر کوڑکو، بھیل، بھنگی، چمار، گونڈ، جنگلی قبائل، ناگا لوگ اور نیپالی گورکھے بھی گائے کا گوشت کھلے عام استعمال کرتے ہیں، سرکس والے اپنے جنگلی جانوروں کو گائے کا گوشت ہی کھلاتے ہیں، مسلمان جتنا گوشت کھاتے ہیں اس کا بیس گنا گوشت تو یہ سب لوگ کھا جاتے ہیں۔ اب اگر مسلمان گائے کے گوشت سے ہاتھ اٹھالے تو کیا باقی سب اکائیاں اس میں ہمارا تعاون کریں گی جبکہ دیگر گوشت خور ذاتیں، مذہب اور قبائل ہمارے ساتھ نہ ہوں صرف مسلمانوں کے تعاون سے کچھ بھی بات نہیں بن سکتی۔

اس ملک میں ہڈیوں کی تجارت چمڑے خاص طور سے ذبح کئے ہوئے جانوروں کے چمڑے بہت قیمتی مانے جاتے ہیں اسکے کارخانے جوتے کی فیکٹریاں جس میں کئی کئی لاکھ لوگ کام کرتے ہیں، جوتے چپل کی صنعت باٹا Bata کمپنی کی ملک گیر صنعت، نیز چمڑے کی پیٹیاں، تکیے، بیگ، کمر پٹے، بٹوے، پاکٹ ان سب کے کارخانے چلانے والے سب مسلمان نہیں بلکہ زیادہ تعداد میں دوسرے لوگ شریک ہیں، بڑے بڑے ہوٹل جس کے چلانے میں شاید سرکار بھی حصہ دار ہے وہاں بڑے پیمانے پر گائے کا گوشت پکا کر بیچا اور کھلایا جاتا ہے کیا یہ سب مسلمان ہیں؟

یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ گائے کا گوشت یہاں سے (EXPORT) ہو کر دوسرے ملکوں میں بھیجا جاتا ہے۔ اور میری معلومات کے مطابق اس تجارت میں ہندو بھائی لاکھوں کروڑوں روپے کما لیتے ہیں پھر ملک کے سرکاری مہمانوں کو بیف پیش کرنے والے کیوں چھوڑے جائیں جو گائے کا گوشت کھلانے کے حصہ دار ہیں ظاہر ہے یہ کام بھی مسلمان نہیں کرتے۔ "کاف لیدر" جو بچھڑے کا چمڑا ہے اور بڑی بھاری قیمت پر امریکہ بھیجا جاتا ہے اس کاروبار میں آپ کو ایک بھی مسلمان نہیں ملے گا۔

اب رہا گوشت استعمال کرنے کا معاملہ تو مسلمان صرف اُن جانوروں کا استعمال کرتا ہے جو حلال اور جائز ہیں آپ کے سامنے قرآن کی ایک آیت پڑھ کر سناتا ہوں جس سے آپ کو صحیح اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کو گوشت کھانے کے سلسلے میں کتنی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

"حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ والمنخنقۃ والموقوذۃ والمتردیۃ والنطیحۃ وما اکل السبع۔ (۵۔ المائدہ۔ ۳)

(تم پر حرام کر دیا گیا مردار جانور، خون اور سور کا گوشت بھی حرام ہے، اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام جس جانور پر پکارا گیا وہ بھی حرام ہے اور جو جانور گلا گھونٹ کر مارا جائے اور چوٹ لگ کر مرے، یا اوپر سے گر کر مر گیا ہو اور سینگ کی مار سے مرا ہوا جانور یہ سب حرام ہیں اور درندوں نے جس جانور کو مار کھایا ہو وہ بھی حرام ہے۔)

قرآن کے اس حکم نے آج کے مشینی قتل خانوں کے "Machanical Slatar House" اُن تمام جانوروں کو بھی حرام کر دیا جن کو مشین کے ذریعہ قتل کیا جاتا ہے۔

آپ کو سنکر تعجب اور حیرت ہوگی کہ مشینی قتل خانوں کا گوشت مسلمان ہرگز نہیں کھاتا پھر

یہ کون لوگ ہیں جو یہ گوشت کھا جاتے ہیں ان کو اس مسئلے میں منسلک سمجھنا چاہیئے اور انہیں بھی اس کے حل کے لئے آواز دینی چاہیئے۔

قرآن کی چھ نمبر کی سورہ انعام میں آیت ۱۴۳-۱۴۵ میں بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے، بیل کھانے کی اجازت دی گئی ہے لیکن کوئی بھی جانور اسلام کے خاص طریقہ کے مطابق حلال کئے بغیر مسلمان نہیں کھا سکتا، میں آپ کو بتا دوں کہ جانور کو قبلہ رُخ لٹانا، اس پر اللہ اکبر کہنا، اور کہنے والے کا مسلمان ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم ذبح کریگا تب بھی مسلمان کو یہ جانور کھانا حرام ہوگا پھر ذبح کا طریقہ بھی ایسا کہ جانور کو کم سے کم تکلیف ہو، کسی غیر اسلامی طریقے سے جانور کو تڑپا تڑپا کر اور بہت تکلیف دینے والے کسی بھی طرح کے جھٹکے کا استعمال مسلمان کے لئے منع ہے۔ اب یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ اسلام میں گوشت کھانے کی بہت سی شرطیں ہیں ان شرطوں کو پورا کئے بغیر کسی جانور کا گوشت کھانا جائز نہیں۔ کیا مسلمانوں کے علاوہ دوسری گوشت کھانے والی قومیں اپنے اوپر اتنی پابندیاں لازم مانتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ ہمارے دوسرے گوشت خور بھائی اتنی پابندیاں نہیں مانتے تو خوب سمجھنا چاہیئے کہ حلال اور حرام میں اتنا ہی فرق ہے جتنا بدکاری اور نکاح میں فرق ہوتا ہے، جس طرح ایک شخص کسی بازاری عورت سے زنا کرتا ہے یعنی جنسی ضرورت پوری کرتا ہے تو مذہب کی نگاہ میں وہ بدکاری کا فعل ہے اور ایسے بدچلن شخص کو سزا دینے کی وعید ہے، لیکن اگر کوئی شخص نکاح کرتا ہے اور اپنی عورت سے جنسی ضرورت پوری کرتا ہے اسے بدکار نہیں کہتے۔ ظاہر ہے بدچلن آدمی اور نکاح کرنے والا دونوں ایک ہی فعل کرتے ہیں لیکن ایک کا فعل گناہ ہے اور دوسرے کا فعل جائز ہے بلکہ صرف جائز ہی نہیں سوسائٹی کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

اس طرح جو لوگ قاعدے کی پابندی کئے بغیر اندھا دھند گوشت خوری کرتے ہیں اور جو لوگ قاعدے کی پابندی کے ساتھ اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں اور گوشت کا استعمال کرتے ہیں قانون اور مذہب کی نگاہ میں دونوں کو الگ الگ مرتبہ دیا جانا چاہیئے! انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اس مسئلے میں ہر پہلو پر غور کرنا چاہیئے۔

معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو صرف وہی گوشت کھانا جائز ہے جو حلال طریقے سے اور اجازت دئے ہوئے جانور کا گوشت ہو۔ ہر طرح کے حرام حلال جانور اور بغیر کسی پابندی کے ہر ایک جانور کو کھا جانا مشینی قتل خانوں میں کاٹے ہوئے جانور کو کھا جانا جو لوگ پسند کرتے ہیں اُن پر مجھے کوئی اعتراض نہیں البتہ میں یہ ضرور بتانا چاہوں گا کہ یہ تصور کرلینا کہ صرف مسلمان ہی گوشت خور ہے اور گائے کا استعمال بھی صرف مسلمان کرتا ہے تو اس مسئلے میں غلط راہ پر چل جانے کے بعد غور و فکر کرنا ایک مہمل اور بے معنی بات ہوگی۔

ہمارے ہندو بھائیوں میں جو لوگ گائے کے ادب و احترام اور تقدس کے قائل ہیں اُنکی خدمت میں نہایت ہمدردی اور ادب سے عرض ہے کہ آپ اہنسا اور عدم تشدد پر یقین رکھتے ہیں آپ رحمدل ہیں بلکہ اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق سانپ کو دودھ پلاتے ہیں کیا آپ مسلمانوں کے ساتھ اس معاملہ میں اس بات سے متفق نہ ہونگے کہ مسلمانوں کو جتنا تعلق گائے کے گوشت سے سمجھا جاتا ہے اس سے بیس گنا تعلق دوسری قوموں کا اس مسئلہ سے ہے۔ اب مسلمان جب یہ بات سنتا اور پڑھتا ہے کہ گائے کے بارے میں صرف میری طرف انگلی اٹھائی جاتی ہے تو قدرتی طور پر اس کا دل دُکھی ہوتا ہے، امید ہے میرے ہندو بھائی ہماری اس تکلیف کا ضرور احساس کرینگے کہ ہماری طرف صرف اتنا ہی اشارہ کیا جائے جتنا کہ ہمارا تعلق ہے، باقی دوسری لاتعداد اور ان گنت باتیں جو گائے کے متعلق ہیں اُن کا ہم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس مسئلہ کا حل مسلمانوں کے سوا دوسری بہت سی قوموں سے تبادلہ خیالات اور فیصلوں کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے فقط مسلمانوں کے لاکھ تعاون کے بعد بھی مسئلہ جوں کا توں ہی رہے گا جیسا کہ اب تک رہا ہے۔

مسلمان عالموں نے ابتک اس معاملے میں ہمیشہ ہمدردی کا طریقہ اپنایا ہے وہ آپ کے مذہبی احساسات کو خوب جانتے ہیں آپ کا دکھ درد ہمیں محسوس ہوتا ہے ہمارے مذہبی عالموں نے کل ہند سطح پر ہمیشہ اس مسئلے کو ہندو بھائیوں کے نازک احساسات کو سامنے رکھ کر سوچا ہے اور بڑی احتیاط کے ساتھ اس مسئلے میں ہر وقت ہندو بھائیوں کے مذہبی خیالات کا احترام کیا ہے، اور کبھی بھی اس معاملہ کو اُلجھن میں نہیں ڈالا البتہ سیاسی لوگ اپنے طور پر اس مسئلہ کو اُچھال کر اپنا کرتب دکھاتے ہیں آپ کو اس کے حل کے لئے ہمارے مقتدر، ذمہ دار شخصیات اور علم و فہم لوگوں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، مثلاً

مسلم پرسنل لا بورڈ جس کے ذمہ دار امیر شریعت بہار و اڑیسہ مولانا منت اللہ صاحب رحمانی، کل ہند مسلم مجلس مشاورت کے صدر مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، ندوۃ العلماء کے ناظم حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی جو پیام انسانیت کے داعی اور رہبر ہیں اور ایک عالمگیر شخصیت کے حامل ہیں، نیز مدرسہ دار العلوم دیوبند جو ملک کی ایک عظیم مذہبی درسگاہ ہے اس کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور جمعیۃ العلماء ہند کے مولانا اسعد مدنی صاحب یہ سب لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرچکے ہیں اور ہندو بھائیوں کے نازک احساسات کا خیال رکھتے ہوئے کبھی بھی بدلے کی کارروائی، اُلجھن یا کسی کا دل دکھا کر ان لوگوں نے بات نہیں کی۔ آپ اگر مسلمانوں کے کچلے ہوئے اور غریب عوام کو گائے کے گوشت کے بدلے کے طور پر کسی اور انتظام کی طرف توجہ دیں کریں تو اس مسئلے کو حل کرلینا کوئی مشکل کام نہیں مذہب تو دلوں کو جوڑنے والی طاقت ہے دلوں کو توڑنا اور انسانی برادری میں نفرت اور کھنچاؤ تناؤ پیدا کرنا مذہب اور دھرم کا مقصد کبھی نہیں ہو سکتا مسلمانوں کے ذمہ دار لوگ آپ کو ہر طرح اس مسئلے کے تمام پہلوؤں میں معاون ہوں گے بات صرف اتنی دھیان میں لانی چاہیئے کہ فقط مسلمان کو ہی اس ملک میں حفاظت گائے کا ذمہ دار نہ مانا جائے۔ بلکہ متعلقہ تمام گروہ بھی زیر بحث لائے جائیں تاکہ سب کے تعاون سے کوئی عملی شکل بن سکے۔

آج کی اس موقر اور سنجیدہ مجلس میں آنے سے پہلے مجھے یہ سنکر بہت ہی دُکھ ہوا کہ حکومت کے اعلیٰ سطح کے لوگ اور سیاسی جماعتیں گائے کے مسئلے میں مسلمانوں کا نام اُچھال کر غلط ڈھنگ سے اُلجھن پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ہندو بھائیوں کو یہ کہہ کر اُکساتے ہیں کہ مسلمان ہی تحفظ گائے کا بنیادی بیرئیر ہے مجھے امید ہے کہ میری تقریر سے آپ سب کو سوچنے کے انداز میں کچھ معاون خطوط اور نشانات ملے ہوں گے جس پر اس بڑی اہم کانفرنس میں دانشوروں کو، حکومت کے ذمہ داروں کو، اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ سماجی کارکنوں کو فیصلے کرنے میں سہولت ہوگی۔ اب میری چند گذارشات اسی ضمن میں بطور مشورے کے غور کرنے کے لئے سامنے رکھی جائیں تو شکر گذار ہوں گا۔

۱۔ گاؤ کشی یعنی گئو ہتیا اور گئو رکشا یعنی تحفظ گائے، دونوں باتیں الگ الگ ہیں دونوں کو الگ کرکے غور کیا جائے۔ بے ضرورت اور بے مقصد کسی جانور کو قتل کرنا اسلام میں تو جائز ہی نہیں البتہ حفاظت گائے کے مسئلے میں ہندو بھائیوں کے احساسات کی رعایت کے لئے سوچا جانا چاہیئے۔

۲۔ اس مسئلے پر بدھ، ہریجن، عیسائی، مسلمان، پارسی، ساؤتھ انڈین، بھیل، گونڈ، کوڑکو، آدیواسی، نیپالی گورکھے، ناگا قبائل، چمار، بھنگی اور دوسرے وہ ہندو بھائی اور غریب مزدور جو مجبوری اور غربت سے گائے کا گوشت کھاتے ہیں، پھر سرکس کے نمائندے جو اس ملک میں روزانہ سینکڑوں پالتو درندوں کو گائے کا گوشت کھلاتے ہیں اور جوتے، چمڑے، ہڈی کے کارخانے والے، دوسرے قصاب بھائی نیز باٹا کے جوتے کی فیکٹری کاف لیدر کے بیوپاری اور ان کے نمائندے، گائے کے چمڑے اور گوشت کا (EXPORT) کرنیوالے، چمڑے کی پیٹیاں، بیگ، پاکٹ، بیلٹ، بٹوے وغیرہ بنانے والے اور تمام متعلقہ افراد کے ساتھ تمام صوبائی حکومتوں کے وزرائے اعلیٰ اور حکومت ہند کے نمائندے کسی ایک جگہ ایک ٹیبل پر بیٹھ کر سوچیں اور انسانی ہمدردی کے ساتھ غور و فکر کریں۔

۳۔ جو لوگ تحفظ گائے میں مذہبی احساسات رکھتے ہیں وہ ایک ایک ناکارہ گائے کو جو دودھ نہیں دیتی اسے اپنے گھر پر پرورش کریں اور کسی قیمت پر اسے نہ بیچیں گے ایسا حلف لیں تاکہ ناکارہ جانور بکنے بند ہوں۔ دودھ دینے والا جانور بڑا قیمتی ہوتا ہے ہر ایک اسے پالتا ہے، سوال ناکارہ گائے کا ہے جسے خوراک دینے رہنا مذہبی عقیدے کے اعتبار سے صرف ہمارے ہندو بھائی ہی کر سکتے ہیں یہ قربانی بہرحال اُنہیں دینی ہوگی کہ ہر ہندو بھائی ایک ایک ناکارہ گائے کی پرورش کرے۔

۴۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے مرکزی حکومت ایک "گائے منسٹری" تشکیل دے اور اس کے تحت ایک مشاورتی بورڈ بنائے جس میں اس سے متعلق تمام اکائیوں کے نمائندے مل جل کر اس مسئلے کا موثر حل نکالیں۔

۵۔ اس سے پہلے کہ حکومت اپنے مشینی قتل خانے بند کرے گائے کا گوشت حکومت اپنی ہوٹلوں میں بند کرے۔ کاف لیدر (بچھڑے کا چمڑا) کا ایکسپورٹ نہ کیا جائے۔ آج کے حکمراں جب عوام میں تھے تو یہ سب باتیں وہ کہا کرتے تھے لیکن اب صرف مسلمانوں کا نام لے کر اصل مسئلے کے حل سے حکام ہٹنا چاہتے ہیں۔ اور بات کا رُخ مسلمانوں کی طرف موڑنا ترک کریں۔

۶۔ جوتے، چپل، بیگ اور چمڑے وغیرہ کے کارخانوں میں جو مزدور کام کرتے ہیں ان کے ہر جانے پر غور کیا جائے اور انھیں دوسرا کام دلانے کے بارے میں منصوبے بنائے جائیں۔

۷۔ گوشت خور غریبوں کو چھوٹے جانوروں کے گوشت سستے دام میں ملنے کی سہولتیں دی جائیں اور کوئی موثر اقدام کیا جائے تاکہ قصاب برادری کسی دوسری صنعتی لائن میں کام کرسکے۔

۸۔ ہندو مذہبی رہنما عام ہندو بھائیوں میں گوشت خوری کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکیں اور اپنا مذہبی اثر اور حکم استعمال کریں تاکہ جن کو گوشت کھانا مذہبی نقطۂ نظر سے جائز ہے انھیں بھی غذا سستے داموں حاصل کرنے میں دقت نہ ہو اور گائے کا گوشت کھانے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

۹۔ ابھی تک جس طرح اس مسئلے پر صرف مسلمانوں کی طرف اشارہ کرکے سوچا جاتا رہا اس طریقے سے ملک کے بہت سے بے گناہ بھی مارے گئے قتل ہوئے اور ناحق اُن کے خون بہے مسلمانوں کے ہاتھ ہی انسانیت کا قتل عام ہوا اس طریقے کو بند کرکے انسانی ہمدردی اور غذائی ضرورت

یہ ایک لمحہ، جو صدیوں پر بھاری ہے

پاکستان ——— کے

علماء کرام سے

چند گزارشات

سید محمد الحسنی ——— اڈیٹر: البعث الاسلامی

قوموں کی زندگی میں بعض ایسے تاریخی لمحات آتے ہیں جن میں بہت طویل عرصہ کے لئے اور بعض اوقات صدیوں کے لئے ان کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ ہمارا پڑوسی پاکستان بھی اپنی تاریخ کی ان نازک گھڑیوں سے گذر رہا ہے جن میں آئندہ طویل برسوں کے لئے اس کی سیاسی و ملی زندگی کا رُخ متعین ہو جائے گا اور اس کے بعد اس میں کوئی ترمیم یا تبدیلی ممکن یا کم از کم آسان نہ ہوگی۔

سیاسی بازی گری، جماعت سازی اور گروہ بندی، صوبائی اختلافات یا بیرونی مفادات اور بین الاقوامی تعلقات کو تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دیجئے یہ وقتی سیاست کی باتیں ہیں اور ہماری مداخلت بھی اس میں بیجا ہوگی، یہ دیکھئے کہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اس کشمکش کی اہمیت اس وقت کیا ہے جو پاکستان میں برپا ہے اور بہت تیزی کے ساتھ نقطۂ عروج پر پہونچ رہی ہے۔

اس تاریخی لمحہ کا ایک پہلو جتنا مسرت انگیز ہے دوسرا اسی قدر تکلیف دہ اور غم آمیز، مسرت انگیز پہلو یہ ہے کہ کسی اسلامی ملک میں پہلی بار اسلامی عناصر کو اس کا موقع مل رہا ہے کہ وہ اسلامی زندگی اور اسلامی قانون کے احیاء کے لئے پارلیمانی راستہ سے معاشرہ کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لے لیں اور خدا کے منشاء و مرضی کے مطابق نئی زندگی اور نئی سوسائٹی کی تشکیل کریں اور دنیا کے سیاسی اسٹیج پر اسلامی نظام کا وہ دلکش نظارہ پیش کر سکیں جو مغرب کی فتوحات اور خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد بلکہ بعض لحاظ سے اس سے بھی پہلے سے ایک خواب بن چکا ہے۔ ایک شیریں خواب جو کبھی لیبیا میں امیر سنوسی نے دیکھا تھا اور کبھی بالاکوٹ میں سید احمد شہید نے۔ اگر اس تصویر خوش خیالی پر محمول کیا جائے تب بھی اس میں کلام نہیں کہ اس کشمکش میں اسلامی عناصر کی فتح کم از کم کمیونزم و لادینیت اور مغربیت کے اس سیلاب کو ضرور روک سکتی ہے جو پاکستان کی اسلامی شخصیت کے لئے ایک حقیقی اور ٹھوس خطرہ ہے۔

پارلیمانی جمہوریت کے راستہ سے یہ وہ پہلا تجربہ ہے جو کسی اسلامی ملک میں اس قدر باقاعدگی کے ساتھ ہونے جا رہا ہے اور اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا احساس ان عرب ملکوں کے اسلام پسند عوام کو بھی ہے جن کی ایک پوری نسل فوجی آمریت کے زیر سایہ تیار ہوئی ہے اور جو بہت رشک کے ساتھ اس کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

تکلیف دہ اور غم آمیز پہلو یہ ہے کہ اس نازک اور تاریخ ساز لمحہ میں بھی اسلامی محاذ میں اتحاد نہیں۔ اور وہ مغربیت اور کمیونزم کے اس عظیم خطرہ سے پوری طرح آگاہ نہیں جو ان کے سر پر موت کی طرح منڈلا رہا ہے، یا مصلحت و مفاد، دیرینہ عداوتوں، پرانی رنجشوں اور ذہنی اختلافات کا شکار ہیں، اور اسی غبار خاطر نے ان کو اس متحدہ خطرہ کا متحدہ مقابلہ کرنے سے روک رکھا ہے، جو ان میں سے کسی کو معاف کرنے والا نہیں اور جس کا سب سے پہلا شکار اور لقمۂ تر خدا نخواستہ وہ علماء کرام ہوں گے جن پر اس وقت اصولاً، عقلاً اور شرعاً سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

یہ ایک کُھلا ہوا معرکہ ہے اور کھلے ہوئے نمائندوں کے درمیان، ایک طرف اسلام کے نمائندے ہیں، خواہ وہ طبقۂ علماء سے ہوں یا جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہوں یا کسی بھی اسلامی مکتب خیال اور مدرسۂ فکر سے وابستہ ہوں، دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ان میں سے کسی کا چیز سے تعلق نہیں رکھتے ہیں بلکہ بالکل دوسرے سرے پر ہیں ان کی پہچان بھی کھلی ہوئی ہے۔ اول الذکر نمائندے جیسے برے بھلے ہوں ان میں آپس میں جیسے بھی اختلافات ہوں ایک لڑی ان سب کو تسبیح کے دانوں کی طرح پروئے ہوئے ہے اور وہ یہ کہ ہمیشہ وہ اسلام کے داعی، علوم دین کے خادم شریعت کے پاسبان اور مسلمانوں کے دینی ترجمان سمجھے گئے۔ انہوں نے کبھی کمیونزم اور سوشلزم کی دعوت نہیں دی، کبھی علیحدگی پسندی کا نعرہ نہیں لگایا، کبھی شراب نہیں پی، رقص نہیں کیا، جوا نہیں کھیلا، غیر اسلامی قوانین کی حمایت نہیں کی، مختصر یہ کہ ان کی پوری زندگی قال اللہ و قال الرسول اور دین کی دعوت اور نصرت و حمایت میں گزار کر۔ آخر الذکر نمائندے بھی کھلی کتاب کی مانند ہیں وہ اس کے برعکس کبھی اسلام کے داعی اور مسلمانوں کے دینی رہبر اور پیشوا نہیں سمجھے گئے وہ صرف اس اسلام کے قائل ہیں جو حسب ضرورت ہو۔ پہلے انہوں نے سوشلزم کی صدا لگائی پھر حالات کا تقاضہ دیکھ کر اسلامی سوشلزم کا اضافہ کیا اور جب حالات اس کے موافق نظر آئے تو اب یہ کمیونزم اور سوشلزم "مساوات محمدی" بن چکا ہے۔ یہ گروہ چونکہ کبھی بھی اسلام پسند نہیں سمجھا گیا اس لئے مغربیت کی بخشی ہوئی آزادی و بے قیدی سے (خواہ وہ نظریاتی ہو یا عملی) اس نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا، نہ کبھی اس نے اس کے لئے معذرت کی ضرورت سمجھی نہ مسلم عوام اور علمائے کرام اس سے اس کی توقع رکھی۔

یہ ایک قدرتی تقسیم تھی جو برسوں سے چلی آرہی ہے کوئی آنکھ ایسی نہیں ہے جو اس کو دیکھ نہ رہی ہو، اب زندگی بھر اس طبقہ کی مخالفت کرنے والے علماء اگر ایسے نازک موقع پر (جس کے اثرات بہت دور رس ہوں گے) اس کی اچانک حمایت میں سرگرم عمل ہو جائیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟

اس کے جواب میں سب سے بڑی بات شاید یہی کہی جا سکتی ہے کہ جماعت اسلامی دین و ایمان اور عقائد میں ان لوگوں سے بھی زیادہ خطرناک ہے، کہا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی کے ساتھ بیٹھنا اس لئے مشکل ہے کہ اس نے اپنے ماننے والوں میں صحابۂ کرام کی بے حرمتی کا ذہن پیدا کر دیا ہے اور اسی روش سے بہک گئی ہے جو ہمارے اسلاف کا امتیاز ہے اس بات کی تردید یا تائید کی چنداں ضرورت نہیں اس لئے کہ ہمارا مقابلہ ان لوگوں سے ہے جن کو سرے سے اسلام ہی پر اعتماد نہیں۔ جو اسلامی قانون کو فرسودہ سمجھتے ہیں، اور مارکس و لینن کا قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں جن کو اسلامی زندگی پسند نہیں اور وہ مغرب کی آزاد و بے قید زندگی کے متوالے ہیں جو الاخیر زمانوں میں بھی ترمیم جائز سمجھتے ہیں جو منفقہ طور پر اسلامی قانون میں داخل ہیں اور جن کو ہر مسلمان بلکہ سارا عالم ——— جانتا ہے۔

علمائے کرام کا منصب تو یہ تھا کہ سوشلزم کی گاڑی کے قلی بار بردار اور مزدور بننے کے بجائے زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لیتے اگر وہ جماعت اسلامی کے ساتھ تعاون نہیں کرنا چاہتے تھے تو نہ کرتے، لیکن ان "سرخ انگاروں" کی دلالی میں جو جل کر کوئلہ ہو رہے ہیں ہاتھ منہ کالا کرنے کے سوا انہیں کیا ملے گا؟

اس وقت معرکہ صرف یہ ہے کہ پاکستان کدھر جاتا ہے؟ مکمل اسلام کی طرف یا مکمل اشتراکیت و کمیونزم اور مغربیت و مادیت کی طرف جہاں خدا اور رسول کا بنایا ہوا قانون چلے گا یا انسانوں کا خود ساختہ بلکہ کافروں، ملحدوں اور دشمنان دین کا وضع کردہ قانون خواہ وہ روس کا ہو یا چین کا، یا برطانیہ اور امریکہ کا یا ان کے عقیدت مندوں اور نیاز مندوں کا۔

اس بنیادی کشمکش اور اصول معرکہ میں ان اختلافات کا محل نہیں جو دوسرے موقع پر واقعی اہم ہوتے ہیں۔ مصر میں ایک دفعہ اس بحث نے بہت شدت اختیار کر لی کہ عورت کا چہرہ چھپانا ضروری ہے یا نہیں؟ جب بات حسن البنا تک پہونچی تو انہوں نے کہا کہ پہلے عورت کو پردہ کرو او دو پھر یہ بحث کر لینا، تم نے عورتوں کے پورے جسم کو بے دہ اور بے لباس کر رکھا ہے اور اس بات پر لڑ رہے ہو کہ چہرہ شرعی لحاظ سے ستر ہے یا نہیں۔

اسلام کا بھی پاکستان میں کچھ یہی حال ہے جو مصر کی اس آزاد عورت کا تھا، اس غریب کا سارا جسم زار و نزار ہے۔ خطرہ سر پر ہے، مخالفین اس کا نام تک مٹا دینے کے در پے ہیں اور اسلامی جماعتیں صرف اس بات پر لڑ رہی ہیں کہ اس "مرد بیمار" و گرفتار کے لئے ٹوپی کیسی اچھی رہے گی یا چوگوشیہ اور دو پلی یا کلاہ، شیروانی یا سوٹ؟

"سوٹ ... بہت بڑا ہی عمر ہوست کی علامت اور مغربیت کی نشانی ہی لیکن دوستو! جب سوٹ اور شیروانی پہننے والا ہی نہ رہے گا تو یہ باتیں کیا کام آئیں گی؟

جب اسلامی قانون ہی سرے سے ختم ہو جائے گا جب اس کمیونزم کا سکہ رواں ہوگا جس کا جمہوریت اور آزادی خیال سے کوئی رشتہ نہیں، جب اسلام کے محافظ وہ نوجوان ہوں گے جن کو سر عام بادشاہ نے ننگ سے ننگے لٹکائے ہوئے مار رہیں جن کے جلسوں میں ابھی چند روز پہلے تک خاکم بدہن اسلام مردہ باد کے نعرے لگائے گئے، جن کو اسلام سے زیادہ سندھی اور بنگالی تہذیب عزیز ہے۔ جب وہ بنیادی نہ رہے گا جس پر جماعت اسلامی یا کسی بھی جماعت سے جا اختلاف قائم ہو اور اس میں ہر ایک حقیقت کو [illegible]

کر بنیاد بنا کر فیصلے کئے جائیں صرف مذہبی جنون سے مسئلہ کا حل نہیں ہو سکتا۔

۱۰۔ پسماندہ، پچھڑے ہوئے اور غربت بھرے لوگوں کی غذا گائے نہ بن سکے اس کے لئے ایک بڑا فنڈ ہندو بھائی اپنی انسانی ہمدردی کے تحت خود قائم کریں اور متاثرہ لوگوں تک امدادی ہاتھ بڑھا کر راہ ہموار کریں تاکہ پچھڑے ہوئے لوگ بھوکے نہ مریں اور خوشی سے گائے کا گوشت کھانا ترک کر دیں۔

۱۱۔ چمڑے والے بیوپاری اور کارخانے کے مالکوں نے مجھے بتایا کہ مردار جانوروں کے چمڑے سے بننے والے مال خراب ہوتے ہیں اور عالمی منڈیوں میں صرف حلال جانوروں کے چمڑے کا بنا ہوا مال ہی اعلیٰ درجہ کا اور کوالیٹی میں نہایت ہی عمدہ مانا جاتا ہے۔ یہ لوگ بھی ذبیحہ گائے کے لئے مالی لالچ سے اکسا کر گائے ذبح کرانے کا سبب بن سکتے ہیں، انہیں بھی مجبور کرنا ہوگا کہ اپنے سرمایہ کے زور پر لوگوں کو گائے کاٹنے کے سلسلہ میں ہمت افزائی نہ کریں اور کوئی دوسرا کاروبار تلاش کریں، تاکہ خود ہندو مذہب کے افراد ہو کر گائے کے معاملہ میں خلاف نہ جا سکیں۔

۱۲۔ ہزاروں گائے کے جھنڈ جو سڑکوں پر مفت میں مل جاتے ہیں انہیں بھوکے پیاسے ہانک کر جو بیوپاری ہمارے ملک کے سرحدی علاقوں پر نیپال، پاکستان اور برما والوں کو دس پانچ روپے میں فروخت کر دیتے ہیں۔ پڑوسی ملک کے لوگ اتنے سستے داموں کا جانور کھا لیتے ہیں اور اپنا اناج بھی بچا لیتے ہیں اور ہڈی چمڑے کی الگ قیمت وصول کر لیتے ہیں یہ چیز ہمارے ملک کی معیشت کو تنگ اور اناج کی قلت کو بڑھا دیتی ہے اس کا کوئی حل نکالنے کے لئے سر جوڑ کر بیٹھنا چاہئے، میری جہاں تک معلومات ہے ہندوستانی مسلمان یہ سرحدی تجارت نہیں کرتا کہ وہ پہلے سے بدنام ہے اور ڈرا سہما ہوا بھی۔ دوسرے بہت لوگ کھلے عام برما، پاکستان اور نیپال کی سرحد پر لاکھوں گائے پڑوسی ملک کے حوالے کر آتے ہیں اور سڑک پر خسری کی ملکیت سے مفت مل جانے والے جانوروں کو غیر ملک میں بیچتے ہیں۔

۱۳۔ جو لوگ ہندو ہو کر بھی گائے کا گوشت کھاتے ہیں انہیں ہندو مذہبی رہنما سختی سے منع کریں اور روک لگائیں ایسے لوگوں کو جو کسی مذہب کے ہو کر بھی اس مذہب کے خلاف عمل کرتے ہیں انہیں منافق اور دروغ گو مان کر سماج اور سوسائٹی سے باہر کر دینا چاہئے اور ان کا سماجی بائیکاٹ ہو جانا چاہئے یہ عظیم قدم اٹھانا ہندو مذہبی عالموں، شنکر اچاریوں اور پنڈتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی مذہبی طاقت کا استعمال کر کے گائے کا گوشت کھانے کی اس روش کو جو خود ہندو بھائیوں کے درمیان جاری ہے پوری طاقت سے روک لگائیں۔

اسلام میں جن جانوروں کا کھانا حرام ہے اس کا کھانا مسلمانوں کو منع ہے اگر کوئی ایسا جرم کرے تو اسے اسلام سے خارج کر دینے کا ہمارے یہاں انتظام ہے یہی وجہ ہے کہ مسلم عالم دین ہمیشہ اس کا خیال رکھتے ہیں کہ جو مذہبی لحاظ سے منع ہے اس کا استعمال کرنے والے کو سماج سے نکال دینا چاہئے تاکہ وہ شادی، بیاہ، کفن دفن سے مجبور ہو کر مذہب کے خلاف کسی عمل کی جرأت ہی نہ پیدا کر سکے۔ ہندو دھرم اچاریوں کے لئے اپنے مسلم بھائیوں کا یہ نمونہ کام کا ہے اگر اس کا استعمال کر کے ہندو مذہبی رہنما گائے کا گوشت کھانے والے ہندو کو مذہب سے الگ کرنے کا اعلان کرنے لگیں تو گائے کا گوشت کھانے کی ہندو بھائیوں کی عادت ختم ہو جائے۔

۱۴۔ اپنی طرف سے میں اپنے ہندو بھائیوں سے صاف دلی سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اس ملک میں آپ کی محبت اور الفت ہندو مذہب میں دَیا (رحم) حتیٰ کہ جانوروں کے ساتھ بھی ہندو بھائیوں کا تعلق دَیا اور رحم کا ہے اس لحاظ سے اپنے مسلمان بھائیوں جو آپ کے چھوٹے بھائی ہیں آپ حق و انصاف کے تقاضوں اور انسانی رشتے اور تعلق کو کبھی فراموش نہ کریں۔

اور مسلمان بھی اپنی طرف سے اسلام کی دعوت توحید اور پڑوسیوں کا وہ حصہ جو مسلمانوں پر بطور قرض اب تک باقی ہے اپنے ہندو بھائیوں کی خدمت میں پیش کریں۔

ایک حقیقت پسند انسان، ایک سچے ہندوستانی اور پوری انسانی برادری کے ایک ہمدرد کے ناطے یہ اپیل کروں گا کہ اس مسئلے کو کسی ایک فریق سے ہرگز نہ جوڑا جائے بلکہ حق و انصاف کی ترازو میں جس جس طبقہ کا اس مسئلے سے تعلق ہو ان سب لوگوں کا تعاون حاصل کیا جائے۔

اور آخر میں مجھے پیار و محبت اور دل کی گہرائیوں سے کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہندو بھائی ہم سے بڑے ہیں بڑے بھائیوں کا ادب و لحاظ ہمارے ذمہ ہے اور مسلمان آپ کے چھوٹے بھائی ہیں چھوٹوں کے ساتھ رعایت و سہولت کا معاملہ ہونا چاہئے۔

آپ نے میری باتوں کو صبر و سکون کے ساتھ سنا اس پر میں آپ کا شکر گذار ہوں آپ کے دئے ہوئے پیار اور بھروسے کی قدر کرتا ہوں اور پھر ایک بار انسانیت کے نام پر انسان کی حفاظت انسان سے محبت آپ سے طلب کرتا ہوں کہ ہماری کسی بھی انسان کا نہ تو دل دکھایا جائے نہ اسے ستایا جائے اور ہر انسان کی جان و مال اور آبرو کا احترام کیا جائے کیونکہ کسی ایک جان کو بھی ناحق قتل کرنے پر پوری انسانیت کا خون بہانے کا دھبہ لگتا ہے اس لئے انسانیت کو خون خرابے سے بچانے کے لئے ہم سب کو مل جل کر کام کرنا چاہئے۔

نثار عباسی

اُردو زبان

کوئی سنتا ہی نہیں آج فغانِ اُردو / بے زبانی کا فسانہ ہے زبانِ اُردو
غیر تو غیر ہیں اپنوں نے نگاہیں پھیر لیں / اپنے ہی گھر میں ہے بے گھر یہ زبانِ اُردو
اس کو کہتے ہیں مسلماں کی زباں تنگ نظر / غیر مسلم بھی تو ہیں اہلِ زبانِ اُردو
وہ جو ہیں تنگ نظر، تنگ وطن، فرقہ پرست / ان کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے زبانِ اُردو
ہر زباں اہلِ زباں کے لئے ہوتی ہے حسیں / ہے مگر اور ہی کچھ حسنِ بیانِ اُردو
متحد جب ہوئی قومیں تو بنی اُردو زباں / ہے محبت کی یہ تاریخ زبانِ اُردو
"نیشنل انٹیگریشن" کا ہے تاریخی ثبوت / "قومی یکجہتی" کا حاصل ہے زبانِ اُردو
کرتی ہے "قومی رواداری" کی عکاسی بھی / باہمی جذبۂ الفت ہے زبانِ اُردو
ہندی الفاظ کو اپنا لیا اپنوں کی طرح / دشمنِ ہندی نہیں ہے یہ زبانِ اُردو
اُردو بھی پیدا ہوئی ہند میں ہندی کی طرح / غیر ملکی تو نہیں ہے یہ زبانِ اُردو
مادرِ ہند کی آغوش کی پروردہ ہے / بہن "ماں جائی" ہے ہندی کی زبانِ اُردو
اس میں ہر مذہب و ملت کی جھلک ملتی ہے / "سیکولرازم" پہ مبنی ہے زبانِ اُردو
بولی جاتی ہے جو گھر گھر تو سمجھتے ہیں عوام / اس لئے پیاری ہے سب کو یہ زبانِ اُردو
روزمرہ میں ڈھلی ایسی کہ پہونچی گھر گھر / ہو گئی زندۂ جاوید زبانِ اُردو
مادرِ ہند کی تہذیب و تمدن کے لئے / اپنے بچوں کو بڑھاتا ہے زبانِ اُردو

ایک مشترکہ وراثت کی یہ حامل ہے نثار
ایک مشترکہ زباں ہے یہ زبانِ اُردو

رُودادِ چمن

ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ جشنِ تعلیمی کی مفصل روداد

مرتبہ: مولانا محمد الحسنی ندوی
مدیر البعث الاسلامی (دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

○ ایک دستاویز ——— ○ ایک کہانی ——— ○ ایک پیغام

ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی (منعقدہ نومبر ۱۹۷۵ء) کی تفصیلی رپورٹ جس کا آپ کو شدت سے انتظار تھا منظرِ عام پر آگئی ہے۔

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

کے ایماء پر یہ روداد مرتب کی گئی ہے جس میں شیخ الازہر کا خطبۂ صدارت، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا تاریخی خطبۂ استقبالیہ اور اجلاس کی دوسری تقریریں، مولانا عبد السلام قدوائی ندوی کے قلم سے ندوۃ العلماء کے ماضی، حال اور مستقبل کا خاکہ، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے مجمع کے وقت کئے ہوئے ایمان افروز بیانات، اہم تقریروں اور مقالات کے خلاصے سب شامل ہیں۔

اس کے علاوہ اجلاس کے وسیع انتظامات اور تیاریوں اور اجلاس کے مناظر کی اس طرح تصویر کشی کی گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے پڑھنے والا خود اجلاس میں شریک ہے اور تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

پوری کتاب دار العلوم کی خوبصورت عمارتوں کی تصاویر نیز دوران اجلاس نمازِ جمعہ کے دلفریب منظر سے بھی مزین ہے۔

○ خوبصورت رنگین ڈسٹ کور ——— ○ دیدہ زیب گٹ اپ
ضخامت: ۳۰۰ صفحات (علاوہ تصاویر) قیمت: مجلد صرف ۱۵ روپے

ملنے کے پتے:
(۱) مکتبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس ۹۳۔ لکھنؤ
(۲) کتب خانہ رشیدیہ، جامع مسجد، اردو بازار، دہلی

عید جنوبی ہند میں

ڈاکٹر سید احتشام ندوی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی۔ کیرالا

★

مسلمانوں میں مذہبی طور پر صرف دو تہوار ہیں عید اور بقرعید ۔ مگر ان کو منانے کے طریقے مختلف علاقوں میں مختلف ہوگئے ہیں۔ شمالی ہند میں عام طور سے عید کی نماز عیدگاہ میں ادا کی جاتی ہے۔ عیدگاہ کے باہر اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا ہے جو عموماً "دوگانہ" کہلاتا ہے یہ دوگانہ دو رکعت سے نکلا ہے۔ ان میلوں میں مٹھائی، گوشت، کباب اور کھلونوں کی دوکانیں لگتی ہیں، دیہاتوں میں یہ میلے بڑے دلکش ہو جاتے ہیں اور عید لوگوں سے ملاقات کرنے کا ایک عمدہ موقع بن جاتی ہے، پھر اعزہ واحباب کے گھر جانے اور سویوں کی پیشکش۔ دکن میں بھی تقریباً ایسا ہی رواج ہے مگر وہاں پر عیدگاہ میں قبرستان ہونا ضروری ہے۔

کیرالا میں عیدگاہیں نہیں ہوتیں۔ لوگ اپنے محلہ کی مسجد میں نماز ادا کر لیتے ہیں۔ اس لئے عید میں جو کیفیت شمالی ہند اور دکن میں محسوس ہوتی ہے کہ لوگ جوق در جوق آبادی سے باہر نماز کے لئے رواں دواں نظر آتے ہیں اور عید کی چہل پہل محسوس ہوتی ہے اس کا کیرالا میں پتہ نہیں چلتا ۔

عید کے دن سویاں بھی لازمی طور نہیں پکتیں اور تقسیم کے لئے تو بالکل کوئی اہتمام نہیں ہوتا ۔ دکن میں بھی اس کا اہتمام کم ہے مگر شمال میں عید کے موقع پر بڑی تعداد میں سویاں پکتی ہیں اور باہر رکھ دی جاتی ہیں اور باہر آنے والے کو پیش کی جاتی ہیں۔ ایک بار عید کے دن میں ایک دوست کے یہاں گیا انہوں نے چائے اور کچھ نمکین چیزیں پیش کیں میں نے دریافت کیا کہ کیا عید میں سویاں یا کوئی مخصوص چیز نہیں پکتی بولے بالکل نہیں، بس عام دنوں کی طرح آج بھی کھانا پکا ہے البتہ کھانا بہتر پکایا جاتا ہے۔ مجھے عید بڑی پھیکی لگتی ہے اور نگاہ تصور میں اپنے وطن کی عید مصور ہو جاتی ہے جہاں صبح سے شام تک چہل پہل رہتی ہے، قافلہ پر قافلہ آتے ہیں اور سویاں نوش کرتے ہیں۔ یہاں عید کے دن دوسروں کے گھر جانے کا رواج ہی نہیں ۔

علی گڑھ کی دلکش عیدیں یاد آتی ہیں ہم لوگ بعض پروفیسروں کے یہاں جاتے اور ان محفلوں سے لطف اندوز ہوتے جو ان کے یہاں پہلے سے جمی ہوتیں۔ وہاں گفتگو بھی علمی انداز کی سننے کو ملتی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر عبدالعلیم، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں وغیرہ کے یہاں جاتے اور علاوہ مجلس لطف کے وہاں مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہو جاتیں ۔

جامعہ ملیہ کی عید بھی بڑی دلچسپ ہوتی ہے چونکہ میرے دور میں جامعہ میں بہت تھوڑی آبادی تھی لہٰذا سب ایک دوسرے کو جانتے تھے مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی عیدین کی نماز پڑھاتے اور بڑی دلکش تقریر کرتے ۔ نماز میں اکثر ڈاکٹر ذاکر حسین بھی موجود ہوتے ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین اگرچہ مذہباً شیعہ ہیں مگر عیدین کی نماز سنیوں کے ساتھ ادا کرتے ہیں عید کے دن جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، بڑی شفقت سے ملتے۔ پروفیسر محمد مجیب بھی نماز میں شریک ہوتے ۔

میرا تجربہ ہے کہ عید کی نماز دیہات خصوصاً قصبات میں زیادہ خوشگوار ہوتی ہے جہاں دور دور سے لوگ عید کی نماز پڑھنے کے لئے جمع ہوتے ہیں اعزہ بچوں کو پیسے دیتے ہیں اور لوگ جا بجا جمع ہو جاتے ہیں۔ پورے گاؤں یا قصبہ کا دورہ کرتے ہیں اور سب کے یہاں کچھ کھاتے ہیں۔ عجب دلکش فضا ہوتی ہے ۔

کیرالا میں حفاظ نہیں ہوتے، مساجد میں رمضان میں ختم قرآن کا رواج نہیں، وہی الم تر کیف سے تراویح پڑھی جاتی ہے البتہ اب کچھ رجحان ہو چلا ہے، بعض بڑی بڑی اہم مساجد میں دو ایک جگہ حافظ کا انتظام کیا جاتا ہے مگر اب بھی حافظ بمنزلہ صفر ہے۔ یہاں ایک کالج چند سال پہلے حفظ کا قائم کیا گیا (جنوب میں ہر مدرسہ کو کالج کہتے ہیں، حفظ کے مدرسہ کا نام "تعلیم القرآن" ہے) یہ کیرالا میں پہلا ادارہ ہے جو حفظ قرآن کے لئے قائم ہوا ہے، اس کو یہاں کالی کٹ کے مشہور تاجر خالک کو لمبو اسٹور جناب محمد اسمٰعیل صاحب اور خلیفہ عبدالرزاق کی کوششوں سے یہ کیرالا میں پہلا مدرسہ حفظ شہر کے آخری حصہ "ایڈی مرٹی" میں قائم ہوا ہے۔ اس کے اخراجات بھی یہی صاحب عزم تجار برداشت کرتے ہیں۔ فی الحال یہاں بیس طلبہ ہیں مگر مساجد میں ختم قرآن نہ ہونے کے باعث طلبہ بھی حفظ کے لئے مشکل سے ملتے ہیں۔ اسی بنا پر رمضان اور عید میں یہاں لطف نہیں محسوس ہوتا۔ ختم قرآن کی دلکشی کا کیا کہنا۔ رمضان میں ختم قرآن اور شبینہ سے ایک رونق پیدا ہوتی ہے ۔

البتہ چند باتیں جو یہاں ہیں وہ شمالی ہند میں نہیں پائی جاتیں۔ روزہ تمام مسلمان رکھتے ہیں، بہت کم ایسے ملیں گے جو روزہ نہ رکھتے ہوں، حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی پورے رمضان بھر اہتمام سے روزہ رکھتے ہیں۔ دوسری عمدہ بات یہ ہے کہ رمضان میں یوم شہدائے بدر منایا جاتا ہے اور ان شہداء کو ایصال ثواب کیا جاتا ہے، غریبوں کو مسجد کی انتظامیہ کی جانب سے کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ روزے اور نماز کا پورا اہتمام ہوتا ہے، رمضان میں عموماً مسلم ہوٹل دن کو کھانا نہیں کھلاتے اور ہوٹلوں میں افطار اور سحر کا پورا انتظام ہوتا ہے۔ یہاں محسوس ہوتا ہے کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ دکن میں افطار سے قبل اکثر مسجدوں میں کھانا تقسیم ہوتا ہے، جس کو گنجی کہا جاتا ہے۔

اصل میں ہم لوگ تماشہ بین ہیں یہاں رمضان کی روح پوری طرح جلوہ گر ہے مگر وہ تماشے نہیں ہیں جو شمال میں پائے جاتے ہیں اسی لئے کمی احساس ہوتا ہے۔ البتہ ختم قرآن کا رواج ہونا چاہئے ۔

بقیہ صفحہ ۱۵: یہ ایک لمحہ، جو صدیوں پر بھاری ہے

بھی ہیں، جب ہم کو وہ لوگ خدانخواستہ ڈسیں گے جن کو آج (کسی وجہ سے بھی) ہم اپنا حامی وناصر سمجھ رہے ہیں تو اس وقت نہ علماء کے ہاتھ میں کچھ ہوگا نہ جماعت اسلامی کے نہ کسی اور پارٹی کے ۔

اس وقت خدا کے لئے ایک ہو جایئے اس کے بعد دل کھول کر لڑ لیجئے گا۔ اس وقت آپ میں طاقت ہوگی، آپ زیادہ قوت اور ولولہ کے ساتھ لڑنے کا شوق پورا کر سکیں گے لیکن اگر اس وقت بھی اتحاد کا ثبوت نہ دیا گیا تو پھر اس کا کوئی وقت شاید نہ آئے۔ اور لڑنے کا موقع بھی نہ مل سکے۔ اس لئے کہ کمیونزم کے آمرانہ نظام اور مغربی زندگی کے شکنجہ میں نہ مولانا غلام غوث ہزاروی کی جگہ ہے نہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی، نہ کوثر نیازی کی نہ مولانا احتشام الحق تھانوی کی ۔

اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اشتراکیت کے سابق علمبردار اور "مساوات محمدی" کے موجودہ دعویدار اقتدار کے بعد اسلام کے لئے سینہ سپر ہو جائیں گے اور وہ جن کی پوری زندگی بہرحال اسلام کی دعوت اور دین کی خدمت میں گذری ہے وہ اسلام کے دشمن ثابت ہوں گے تو پھر ہمیں اس سے کچھ نہیں کہنا ہے ۔

یہ بات اس کی سمجھ میں اس وقت آئیگی جب سمجھ میں آنا سود مند نہیں ہوتا۔ اس وقت خدانخواستہ وہ حسرت سے یہ کہے گا ،

" یا ویلتی لیتنی لم اتخذ فلانا خلیلا لقد اضلنی عن الذکر بعد اذ جاءنی و کان الشیطان للانسان خذولا "

(سورۂ فرقان-۲۹)

(میری خرابی ہو کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا، اس نے تو مجھے اس وقت گمراہ کیا جب علم (سچائی) میرے پاس آ چکی تھی اور شیطان ہی ہے انسان کو بے یار ومددگار چھوڑ دینے اور عین وقت پر دھوکہ دینے والا)۔

پرنٹر، پبلشر مسئول سید محمد حسنی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر تعمیر حیات ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔
اڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی

اسلامی معاشرے میں تعلیم کی نوعیت واہمیت

حافظ قاری فیوض الرحمٰن
صدر شعبۂ اسلامیات گورنمنٹ کالج

تعلیم کے معنی:

لغت کے اعتبار سے تعلیم کا مادہ ع۔ل۔م (علم) ہے اس کے معنی کسی چیز کے ادراک کرنے، واقف ہونے اور جاننے کے ہیں، اس سے باب تفعیل میں تعلیم "آتا ہے۔ تعلیم کے معنی بار بار اور کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں حتی کہ متعلم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے ۔

جان ملٹن (John Milton) نے تعلیم کی تعریف یوں کی ہے۔

" میرے نزدیک مکمل اور شریفانہ تعلیم وہ ہے جو انسان کو بحالت جنگ وامن اپنی اجتماعی اور نجی زندگی کے فرائض دیانت ومہارت اور عظمت کے ساتھ ادا کرنے کے لئے تیار کرتی ہے "

A REOPAGITICA AND OTHER PROSE WORKS, P.46

ڈاکٹر پارک (Dr. Park) کا خیال ہے کہ :-

" تعلیم رہنمائی یا مطالعہ سے علم حاصل کرنا اور عادات اختیار کرنے کا عمل یا فن ہے "

Dr. PARK, INTRODUCTION, SELECTED READINGS THE PHILOSOPHY OF EDUCATION, P.3

پس تعلیم وہ مسلسل عمل ہے جس کے ذریعے نئی نسلوں کی اخلاقی، ذہنی اور جسمانی نشوونما بھی ہوتی ہے اور وہ اپنے عقائد وتصورات اور تہذیب و ثقافت کی اقدار بھی اسی سے اخذ کرتے ہیں ۔

اہمیت:

تعلیم ایک ہمہ گیر عمل ہے اور شاگرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس کا گہرا اثر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک قوم کی زندگی کا انحصار ہی اس کی تعلیم پر ہے، ایک چینی کہاوت اس بات کی کتنی صحیح عکاسی کرتی ہے :-

" تمہارا منصوبہ اگر سال بھر کے لئے ہے تو فصل کاشت کرو۔ دس سال کے لئے ہے تو درخت اگاؤ، دائمی ہے تو افراد پیدا کرو "

اور افراد کی تعمیر صرف تعلیم ہی سے ممکن ہے، ہم "طلب علم" کے عنوان کے تحت یہ لکھ چکے ہیں کہ تعلیم انسانی فضیلت وشرافت کا معیار ہے۔ فرشتوں پر حضرت آدم علیہ السلام کو جو برتری عطا کی گئی قرآن مجید کے بیان کے مطابق وہ علم ہی کی وجہ سے تھی۔ اقوام متحدہ نے اب تعلیم کو انسان کے بنیادی حقوق میں شمار کیا ہے مگر اسے انسان کے لئے فرض قرار نہیں دیا۔ اس کے برعکس ہمارے رسول پاک کا حکم ہے کہ علم حاصل کرنا ایک فرض ہے۔ انسان اپنے حق سے دستبردار ہو سکتا ہے مگر فرض سے پہلوتہی نہیں کر سکتا۔

بے عقیدہ تعلیم کی ہلاکت خیزیاں:

اگر ہم آزاد اور بے عقیدہ تعلیم کی ہلاکت خیزیوں کا جائزہ لیں تو مندرجہ ذیل چیز سامنے آتی ہیں :-

ا۔ بے عقیدہ تعلیم طلبہ میں اجتماعی تصورات پیدا نہیں کر سکتی اور جب کوئی قوم ان اجتماعی تصورات کے شعور سے بے بہرہ ہو جائے جو اسے عمل اور قربانی پر ابھارتے ہیں تو تاریخ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے، ایسی اقوام جو کسی اجتماعی نظریے کے زندہ شعور سے محروم ہوں اور جنہوں نے کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لئے جینا اور مرنا نہ سیکھا ہو وہ تاریخ عالم میں کوئی بڑا کارنامہ تو کیا انجام دیں گی اپنے وجود تک کو برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ جب کسی قوم نے اپنی منزل کا شعور کھو دیا تو وہ نقش پا کی طرح مٹا دی گئی۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

مرگِ فرد از خشکی رود حیات
مرگِ قوم از ترکِ مقصود حیات

ب۔ بے عقیدہ تعلیم نئی نسل کے قلب و روح میں اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ اس کا تعلق صرف دماغ کے مطالبات سے ہوتا ہے۔ روح کے مطالبات سے یہ بیگانہ وار ہی گزر جاتی ہے، جو قوم کی تباہی وبربادی کا سبب بنتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ علم اسی وقت حقیقی دوست اور رہنما کا کام کر سکتا ہے، جب اس کا مرکز ومحور دل ہو۔ ورنہ صرف تن پرستی کے چکر میں یہ انسان کے لئے سانپ جیسا خطرناک بھی ہو سکتا ہے، مولانا روم فرماتے ہیں :-

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

ج۔ بے عقیدہ تعلیم ایسے افراد پیدا کرتی ہے جو زندگی کے بنیادی حقیقی، واقعی، اور زندہ مسائل پر کوئی عبور نہیں رکھتے۔ عملی زندگی کے بارے میں ان کا علم اسقدر سطحی سا رہ جاتا ہے کہ اس کی کوئی ٹھوس افادیت باقی نہیں رہتی۔ قومی نقطۂ نظر سے بھی یہ تعلیم مفید نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے اور سبب بھی ضرور ہوں گے لیکن ایک بڑا اور بنیادی سبب وہ غلط اور بے عقیدہ نظام تعلیم تھا۔ جس نے ایک ہی مسلمان قوم کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا، ماہنامہ "میثاق" کراچی کی رپورٹ کے مطابق مدارس میں ۸۰٪ سے زائد ہندو اساتذہ تعلیم دینے پر مامور تھے بے عقیدہ بھلا کیا عقیدہ کی تعلیم دیں گے اور ۲۴ سال تک کے اس عرصہ میں جتنی بھی حکومتیں قائم ہوئیں، انہوں نے صحیح اسلامی نظام تعلیم رائج نہیں کیا، اگر صحیح نظام تعلیم رائج کیا جاتا، تعلیم کی طرف خاص توجہ دی جاتی جو دی جانی چاہئے تھی تو ہمیں یہ روز بد دیکھنا نہ پڑتا۔ ہندوؤں جیسی ذلیل قوم کے سامنے غلط نظام تعلیم کی وجہ سے اس قوم نے ہتھیار ڈال دیئے جن کی پوری تاریخ ہتھیار ڈالنے کے تصور سے خالی ہے اور پھر ۹۳ ہزار افواج کا ہتھیار ڈالنا کتنا باعث ننگ وعار ہے اور آج وہ ملک جو ہمارے ملک کا ایک بڑا حصہ تھا ہم سے جدا ہو گیا اور غلط نظام تعلیم کی وجہ سے اسے پاکستان کے وجود ہی سے نفرت نہیں ہوئی بلکہ اسے "اسلام" کے بجائے سیکولرازم پسند آنے لگا۔

بے عقیدہ تعلیم کی ہلاکت خیزیاں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔

یہ ہم ہی نہیں کہتے وہ لوگ بھی اس غلط نظام تعلیم سے اسقدر بیزار ہو چکے ہیں جنہوں نے ہمارے ملک میں یہ نظام تعلیم اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے جاری کیا تھا۔

سر والٹر موبرلے نے اپنی کتاب "یونیورسٹی میں بحران" میں برطانیہ کے تعلیمی حالات کے مطالعہ پر مشتمل یہ لکھا ہے :-

" ہم جس الجھن میں گرفتار ہیں وہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں زیادہ تر طلبہ تعلیم سے فارغ ہو جاتے ہیں مگر اس کا کوئی موقع نہیں آتا ہے کہ وہ عظیم مسائل پر اپنا ذہن استعمال کریں، تعلیمی غیر جانبداری کے زیر اثر وہ موجودہ سیاسی اور سماجی ماحول کے آگے سپر ڈال دیتے اور سوچ بچار کی زحمت اٹھانے کے عادی ہو جاتے ہیں، اسی طرح وہ لادینیت کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ اس لئے کہ تعلیم کے مختلف اجزا میں منقسم ہونے کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے انہیں ذمہ دارانہ حیثیت میں مقصد زندگی کو متعین کرنے کا چیلنج ہی نہیں ملتا۔ ساری تعلیم کے بعد بھی وہ بنیادی طور پر غیر تعلیم یافتہ ہی رہتے ہیں۔

(Moberly, Sir Walter The Crisis University London - 1949, Page-70)

پروفیسر ایچ اینچ ٹیس (دستان) لکھتے ہیں "تعلیم نے اپنے آپ کو ماضی کے روحانی ورثے سے الگ کر لیا ہے مگر اس کا کوئی مناسب متبادل دینے میں ناکام رہا ہے، نتیجۃً پڑھے لکھے افراد بھی اعلیٰ زندگی کی اقدار کے صحیح احساس سے اور دنیا کے بارے کسی ناقابل شکست ہمہ گیر نقطۂ نظر سے عاری ہیں "[1]

مشہور ماہر نظم والٹر لپ مین نے "اس مضطرب دنیا میں تعلیم کی کیفیت" کے موضوع پر ایک تقریر کی تھی "اسکول اور کالج دنیا میں ایسے افراد بھیج رہے ہیں جو اس معاشرے کے تخلیقی اصولوں کو نہیں سمجھ پاتے جسمیں انہیں رہنا ہے، اپنی ثقافتی روایت سے محروم نئے تعلیم یافتہ مغربی افراد اپنے ذہن وجذبات میں مغربی تہذیب کے تصورات، اصول اور بنیادوں کا اور اس کی منطق اور استدلال کا کوئی احساس وشعور نہیں رکھتے۔ اگر یہی صورت رہی تو موجودہ تعلیم آخر کار مغربی تہذیب کو تباہ کر دے گی اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تباہ کر رہی ہے "

امریکی تعلیم پر "راک فیلر" کی رپورٹ بھی اسی خامی کی نشاندہی کر رہی ہے :

" طلبہ اپنی زندگی کا کوئی مقصد متعین چاہتے ہیں اگر انکا زمانہ انکی ثقافت اور جب انکے رہنما انہیں کوئی تعلیم یا معقد وتصورات نہیں دیتے تو وہ خود اپنے لئے حقیر اور فرومایہ مقاصد متعین کر لیتے ہیں "[2]

---

[1] HIPMAN WALTER, THE STATE OF EDUCATION IN THIS TROUBLED WORLD, VITAL SPEECHES FOR THE DAY JAN. 15, 1941, P. 200.

[2] CURRENT HISTORY, SEP. 1958, P. 147.

ان نئی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب میں بھی بے عقیدہ اور غیر جانبدارانہ تعلیم کا نظریہ دم توڑ رہا ہے اور مغرب کے اکثر ماہرین تعلیم اور علمائے عمرانیات یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی ترقی اور ثقافت کے تحفظ کی راہ میں یہ نظریہ کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

تعلیم کے اسلامی اصول:

اسلام نے جو تصورِ علم دیا ہے اس میں سب سے زیادہ چیز یہ ہے کہ علم کا سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ "علم اشیاء" اسی کا دیا ہوا ہے اور انسان کی ہدایت کا علم بھی اسی کی طرف سے ہے حواس اور عقل و تجربہ بڑے اہم ذرائع علم ہیں لیکن وحی سب سے اعلیٰ ذریعہ علم ہے نیز یہ کہ علم کا تعلق صرف ضروریاتِ زندگی ہی کے ساتھ نہیں بلکہ مقاصدِ حیات سے بھی ہے۔ ضروریات زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ہیں۔ وہ زندگی کا مقصد نہیں ہیں، اس لئے ضروریاتِ زندگی کو مقاصدِ زندگی کے تابع ہونا چاہئے۔

اسلام نے علم کا جو تصور دیا ہے اس میں علم اور تربیت دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے اور ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے مخصوص نظامِ تعلیم میں تعلیم اور سیرت سازی ایک ہی حقیقت کے دو پہلو رہے ہیں۔

مقصدِ تعلیم:

تعلیم بجائے خود منزل نہیں، منزل کے حصول کے لئے ایک ذریعہ ہے حقیقی منزلِ ان لوگوں کا نظریۂ حیات اور تمدن و ثقافت ہے جن کی خدمت اسے کرنی ہے۔" اے۔ این۔ وائٹ ہیڈ" نے یہ کہہ کر اس نکتے پر بہت زور دیا ہے کہ تعلیم کی روح یہ ہے کہ وہ مذہبی ہو۔ ہمارے قومی شاعر علامہ اقبالؒ کا بھی نظریہ یہی تھا کہ اسلام ہماری زندگی اور تعلیم کا مقصد ہونا چاہئے انہوں نے خواجہ غلام السیدین کو ایک خط میں لکھا تھا:۔

" علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہو۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے وہ قوت ہاتھ آتی ہے۔ جس کو دین کے تحت رہنا چاہئے۔ اگر یہ دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے ۔

بو لہب را حیدرِ کرار کن

اگر یہ ابو لہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہئے

کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوعِ انسانی کے لئے سراپا رحمت ہے۔"[1]

پس تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہئے کہ طلبہ میں ان کے مذہب اور نظریۂ حیات کی تفہیم و آگہی پیدا کرے۔

تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت:

امام غزالی لکھتے ہیں:۔

"تعلیم کا مقصد یہی نہیں ہونا چاہئے کہ نوجوان ذہن کی علم کی پیاس بجھا دے بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے اخلاقی کردار اور اجتماعی زندگی کے اوصاف نکھارنے کا اوصاف بھی پیدا کرنا چاہئے۔" (احیاء العلوم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو ملت اسلامیہ کے سب سے پہلے معلم تھے۔ آپ ہی نے پہلی منظم تعلیم گاہ مدینہ منورہ میں قائم فرمائی۔ صفہ نامی چبوترہ پہلا مدرسہ تھا اور اصحاب صفہ اسکے متعلم تھے۔ آپ کے علاوہ دوسرے صحابہ کبار بھی یہاں معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے۔ اس مدرسے نے اسلامی حکومت میں تعلیم کی بنیاد قائم کی اور جو روایت اس میں پڑی وہی ہماری تعلیمی روایت بن گئی اور وہ یہ تھی کہ:۔

اولین چیز دینی تعلیم ہے۔ قرآن و سنت نبویؐ کو نصاب تعلیم کا مرکز و محور ہونا چاہئے اور ساتھ ہی تزکیہ کا بھی انتظام تھا۔ تعلیم کا مقصد:

۱۔ اچھا مسلمان اور داعی الی الحق بنانا۔ اور مسلم معاشرے کی ساری ضروریات کو پورا کرنا ہے۔

۲۔ رسول پاکؐ نے تعلیم اور مسجد کا تعلق قائم کیا۔ مسجد دینی محور، سیاسی مرکز اور تعلیمگاہ بنی اور اس کے ذریعے طالب علم ایک مخصوص ثقافتی ورثے کے امین بنے۔

۳۔ متعلمین کے لئے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے خود محنت مزدوری کرنا اور مختلف حرفتوں کو سیکھنا اور ان سے وابستہ ہونا اچھا، اور پسندیدہ قرار پایا۔

۴۔ تعلیم کی آخری ذمہ داری مسلمان معاشرے اور اسلامی ریاست پر عائد ہوتی ہے اور اسے اس مقصد کے لئے اپنے وسائل استعمال کرنے چاہئیں۔ مسلمانوں کے بیت المال پر اولین حق زیر تعلیم طلبہ اور ان پر ہونے والے جملہ مصارف کا ہے۔

(اسلامی نظریۂ حیات)

[1] SAIGIDIN, K.G., IQBAL'S EDUCATIONAL PHILOSOPHY, LAHORE 1942, P. 99. بحوالہ اسلامی نظریۂ حیات

عالمِ اسلام

پابہ زنجیر بھٹو

مسٹر ذو الفقار علی بھٹو قتل کے ایک کیس میں اسوقت پابجولاں ہیں۔ اور دیگر کئی مقدمات میں بھی عدالتیں انہیں بلا رہی ہیں، ایک صلائے عام کی کیفیت ہے۔ وہ شخص جو اپنی رعونت طنطنہ اور آمریت کے گھمنڈ میں کوس لمن الملک بجا رہا تھا۔ آج اس کا وجود تماشائے عالم بن کر درس عبرت دے رہا ہے۔ قدرت کے قوانین احتساب کتنے اٹل ہوتے ہیں۔ دیر بھی ہوتی ہے تو حکمتوں کی بنا پر اور استدراج کی تکمیل کے بعد مکافات کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ ان بطش ربک لشدید آج وہی بھٹو ہیں اور اس کے انصار و اعوان مگر تاریخ کا بے درد ردِ عمل شروع ہو چکا ہے — اخبارات و جرائد کا ہر صفحہ ان کے شرمناک ظالمانہ اور عیاشانہ کردار کے وہ مناظر دنیا کے سامنے لا رہا ہے کہ شرافت سر پیٹ کر رہ گئی ہے۔ حقائق سامنے ہیں اور اسرار ظواہر بن گئے ہیں۔ قیامت سے پہلے بھی اس عالم میں ایک قیامت کا انکار کیونکر کیا جا سکتا ہے۔؟ یوم تبلی السرائر فمالہ من قوۃ ولا ناصر — اس روز سارے بھید اور خفیہ اعمال کھل کھل کر سامنے آئیں گے۔ پھر نہ تو ان کے پاس اس کی مزاحمت کے لئے قوت ہوگی اور نہ کوئی مددگار ہوگا۔

اعمال و کردار کے ان سیاہ اعمالناموں کو دیکھ دیکھ کر مسٹر بھٹو اور ان کے وزراء و اعیان قیامت سے پہلے آج چیخ رہے ہیں کہ۔ مالھذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا۔ ارے ان فائلوں میں تو ہمارا ہر چھوٹا بڑا گناہ موجود ہے گھر کے بھیدی گواہ بن گئے ہیں اور جرائم کے فرد پر فرد عائد ہوتے جا رہے ہیں۔ ابھی چند ماہ قبل کیا ظلم و فساد تھا، کیا رعونت تھی، کیا طنطنہ اور فرعونیت تھی وہ سب کچھ کہاں گیا۔ آئیے۔ قوانین عروج و زوال کی ابدی صداقتوں کی امین — الکتاب الکریم — میں سے اس کا جواب سن لیں — کم ترکوا من جنات وعیون ٥ و زروع ومقام کریم ٥ ونعمۃ کانوا فیھا فکھین ٥ کذلک واورثناھا قوما آخرین، فما بکت علیھم السماء والارض وما کانوا منظرین ٥ ولقد نجینا بنی اسرائیل من العذاب المھین ٥ من فرعون انہ کان عالیا من المسرفین۔

(الدخان)

(لوگ کتنے ہی باغات، نہریں، کھیتیاں اور عمدہ عمدہ مکانات، عزت و وجاہت کے مناصب اور محافل اور کتنے ہی عیش و عشرت کے سامان چھوڑ بیٹھے جن میں مزے اڑایا کرتے تھے اور جب ہم نے دوسروں کو اس ساز و سامان کا وارث بنا دیا تو نہ تو ہر آسمان رویا نہ زمین (نہ ہمالیہ نے خون کے آنسو بہائے خیبر سے کراچی تک کوئی آنسو بہا) اور نہ انہیں مہلت ملی۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ذلت ناک عذاب سے نجات دی۔ واقعی وہ بڑا سرکش اور حد سے باہر نکل گیا تھا)۔

ان فی ذلک لعبرۃ لمن یخشی۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

(مولانا) سمیع الحق

(ماخوذ ماہنامہ "الحق" پاکستان)

قابلِ توجہ

"تعمیرِ حیات" کی قیمت لاگت سے بہت کم رکھی گئی ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ حضرات مستفید ہو سکیں۔ اس لئے اہل استطاعت حضرات سے پُر زور گذارش ہے کہ حوصلہ مندی سے عطایات عطا فرما کر دینی لٹریچر کی نشر و اشاعت اور ادارہ کی اعانت میں حصہ لیں۔ ان حضرات کی خدمت میں "تعمیرِ حیات" برابر ارسال کیا جائے گا۔

معاونین خصوصی و لائف ممبر -/500 معاونین -/250 اعزازی خریداران سالانہ -/...

(منیجر)

اپنی نوعیت کا منفرد مارشل لاء

از: جناب ماہر القادری
مدیر ماہنامہ "فاران" کراچی۔ پاکستان

مارشل لاء کوئی قابل تعریف اقدام نہیں ہے، کسی بھی ملک کے عوام و خواص نے مارشل لاء کا خیر مقدم نہیں کیا، یہ کڑوی گولی ہے جسے کام و دہن مشکل ہی سے گوارا کرتے ہیں۔ پاکستان میں ایک بار نہیں پانچ بار مارشل لاء نافذ ہو چکا ہے اور عوام نے ہر بار ذہنی اذیت اور روحانی کوفت ہی محسوس کی ہے مگر جس مارشل لاء سے پاکستان دوچار ہے اس کا عوام نے خیر مقدم کیا ہے، جس دن بھٹو صاحب کی وزارت عظمیٰ کا خاتمہ ہوا ہے اور انہیں زیر حراست لیا گیا ہے اس دن لوگوں نے شیرینی تقسیم کی ہے اور شکرانہ کے نفل پڑھے ہیں۔

جس ملک میں جب بھی مارشل لاء آیا ہے تو عوام پر اس کی گرفت شدید و سخت رہی ہے مارشل لاء نے عوام کی آزادی پر پابندیاں لگائی ہیں، اور لوگوں کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کیا ہے اور مارشل لاء پر تنقید کو جرم قرار دیا ہے مگر یہ مارشل لاء اپنی نوعیت کا منفرد مارشل لاء ہے جس نے پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو آزادی عطا کی ہے جس کے دور میں عوام اضطراب و خوف کی جگہ سکون و اطمینان محسوس کر رہے ہیں، مارشل لاء نے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جس کے سبب عوام پریشانی اور الجھنوں میں مبتلا ہو گئے ہوں اور لوگ خود کو فوج کے سخت قوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس کرتے ہوں اسی لئے عوام کے دلوں میں فوج کا بے حد و نہایت احترام پایا جاتا ہے، مارشل لاء ہی کی بدولت سیاسی قیدیوں اور قومی اتحاد کے رہنماؤں کو رہائی ملی ہے، اخباروں کے ضبط شدہ ڈکلریشن بحال ہوئے ہیں، گذشتہ بدکردار حکومت کے کتنے "عزت مآب وزراء" ہیں جو قید خانوں میں بند ہیں یا زیر حراست ہیں، اور عوام خوش اور مطمئن ہیں کہ کوئی آدمی کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اس نے جو جرائم کئے ہیں ان کی سزا اسے ضرور ملے گی، جن کے حکم و ایماء سے بے گناہ لوگ پکڑے جاتے تھے آج وہ خود محبوس ہیں۔

جنرل ضیاء الحق نے مسٹر بھٹو کو وزارت عظمیٰ کے منصب جلیل سے معزول کر کے اُس حکومت کا خاتمہ کیا جس نے پاکستان کے ہر شعبہ میں تباہی مچا رکھی تھی اور قتل و غارت گری، لوٹ کھسوٹ جس دور میں ایک محبوب مشغلہ بن چکی تھی۔ جنرل ضیاء الحق کا یہ اقدام عوام کی تمناؤں کے عین مطابق تھا، اس لئے پبلک نے مارشل لاء کو مرحبا کہا اور اس کا خیر مقدم کیا۔

ہماری اس وضاحت سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم خدانخواستہ مارشل لاء کو عمل خیر سمجھتے ہیں اور اس کے مداح اور قدر شناس ہیں۔ خدا نہ کرے کہ پاکستان میں پھر کبھی مارشل لاء آئے اور موجودہ مارشل لاء تاریخ پاکستان کا آخری مارشل لاء ہو اور اس کے بعد پاکستان میں جمہوریت کے علاوہ کسی اور طاقت کا عمل دخل نہ رہے — مگر جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کو ہم نے اس لئے سراہا ہے کہ یہ اپنی طرز اور مزاج و فطرت کا منفرد مارشل ہے جس کا مقصد ظالموں اور خائنوں کا احتساب اور مجرموں کو ان کے جرائم کی سزا دینا یا عدالتوں سے سزا دلوانا ہے جنرل ضیاء الحق اگر یہ اقدام نہ کرتے تو لاکھوں آدمیوں کے قتل و خونریزی کا خوفناک منصوبہ اسٹیج ہونے کے لئے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔

جنرل ضیاء الحق کی یہ شرافت اور حق پسندی تھی کہ انہوں نے انتخابات کی مدت کا تعین کر دیا اگر وہ ایسا نہ کرتے تو مارشل لاء کے ناظم اعلیٰ کو کون ٹوک سکتا اور مجبور کر سکتا تھا کہ انتخابات کی مدت کا تعین کرو، قاتلوں، ظالموں اور خائنوں کا پوری طرح احتساب اور سرکاری دفاتر کی تطہیر اتنی قلیل مدت میں نہیں ہو سکتی، مسٹر بھٹو کے زمانے میں حکومت کے ہر شعبہ میں کیسی کیسی خیانتیں اور مجرمانہ بدعنوانیاں ہوئی ہیں ان کا پتہ مارشل لاء نے لگایا ہے، اس سلسلہ میں ابھی بہت کچھ تفتیش اور تحقیق باقی ہے، جن سرکاری عہدے داروں نے دفتروں، محکموں، سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں بے ایمانی اور خیانتیں کی ہیں اور پاکستان کے خزانہ کو یغما سمجھ کر لوٹا ہے اور جو ضوابط و قوانین کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں، اس کردار و قماش کے جانے کتنے عہدیدار اور عمال و اہلکار پاکستان کے محکموں اور دفتروں میں اب بھی موجود ہیں۔ ان خائن اور بددیانت سرکاری افسروں کی ہمدردیاں مسٹر بھٹو اور پیپلز پارٹی کے ساتھ ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ مسٹر بھٹو اور پیپلز پارٹی کو اپنے جرائم کی پناہ گاہ اور اپنا حامی و مددگار سمجھتے ہیں۔

انتخابات میں ان کی ہمدردی کا فائدہ پیپلز پارٹی ہی کو پہونچے گا، مارشل لاء اس قبیل کے خائن، بداطوار اور بے ضمیر عہدیداروں اور اہلکاروں کی تطہیر کر سکتا تھا مگر اس کام کے لئے وقت چاہئے، قومی اتحاد انتخابات میں انشاء اللہ جیت جائے گا، جس کی عام توقع اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے — مگر جن بدکردار عہدیداروں، افسروں اور اہلکاروں کی اوپر نشاندہی کی گئی ہے اگر وہ اپنے عہدوں پر بدستور متمکن رہے تو اندیشہ ہے کہ قومی اتحاد کی حکومت کو ناکام بنانے کے لئے یہ لوگ طرح طرح کی خفیہ سازشیں اور شرارتیں کریں گے اور حکومت کے لئے دردِ سر بن جائیں گے۔

"فاران" کا ۲۹ سالہ ریکارڈ اس کا شاہد ہے کہ ہم نے ہر دور کی غلط کار حکومت اور اس کے ارباب حل و عقد پر جرح و تنقید کی ہے اور ہمیشہ کلمۂ حق کہا ہے، ایوب خان کے دورِ حکومت میں ہماری بعض تحریروں پر باز پرس بھی ہوئی تھی مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے معاملہ باز پرس سے آگے نہ بڑھنے پایا، بس ایک آرڈی ننس کے سلسلہ میں راقم الحروف کے "نقش اول" پر سندھ ہائی کورٹ میں مقدمہ قائم ہوا مگر اس وقت کے جج مسٹر ریمنڈ نے ثبوت کو کمزور اور صفائی کو مضبوط پاکر، مقدمہ کو خارج کر دیا — یوں سمجھئے کہ گولی کان پر سے ہو کر نکل گئی، اللہ تعالیٰ کی یہی مشیت تھی کہ مجھ گنہگار ضعیف البنیان کو مصیبت میں نہ ڈالا جائے، اس گزارش کا مقصود یہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق پہلے کرسی نشین ہیں جن کی مدح و توصیف راقم الحروف کے قلم سے نکلی ہے اور اللہ تعالیٰ دلوں کا حال جانتا ہے کہ اس مدح و ستائش میں اعتراف حق کے سوا کوئی اور جذبہ شریک نہیں ہے۔

جنرل ضیاء الحق نے اب تک جو اقدامات کئے ہیں وہ ملت اسلامیہ کی توقعات اور تمناؤں کے عین مطابق ہیں۔ پاکستانی عوام کے دل کی دھڑکنیں جنرل موصوف کی زبان سے الفاظ بن گئی ہیں۔ اب تک پاکستان میں "اسلام" کا نام سیاسی اسٹنٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے کتنے ہی ایسے "رجلِ اول" جن کو نماز اور روزہ سے کوئی واسطہ نہیں تھا جو استطاعت ہوتے ہوئے حج و بغیر ادا نہ کر سکے، جن کی سیرت و کردار اسلامی اخلاق اور پاکیزگی و تقویٰ سے ہم آہنگ نہیں تھے، ظاہر ہے جو اپنے جسم و ذات پر اسلام کو نافذ نہ کر سکے وہ بہزار بائیسل کی حدود میں اسلام کو کس طرح نافذ کر سکتے تھے — تو پاکستان کو اسلام کے پُر شور نعروں اور دعووں کے باوجود اسلامی نظام سے دور ہی رکھا گیا! — جنرل ضیاء الحق اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں، سنا ہے وہ اشراق و تہجد سے بھی شغف رکھتے ہیں، ان کی زندگی صاف ستھری زندگی ہے۔ اور اس پر ان کا ایمان ہے کہ پاکستان کی بقاء اور ترقی و استحکام کا دار و مدار صرف اسلام پر ہے، انہوں نے اپنی کسی تقریر اسلام کے سوا کسی "ازم ۱۳۱۳" کا ذکر نہیں کیا، ان کی تقریریں ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے سنتے ہوئے ایسا محسوس ہوا ہے کہ الفاظ اور آواز کے ساتھ مقرر کا دل بھی شریک ہے، جنرل ضیاء نے اب تک جو اقدامات کئے ہیں وہ اسلام اور ملک و ملت کے لئے مفید ہیں، پاکستان کی تطہیر اور اصلاح کا فرض وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو اپنی ذات سے مردِ مومن ہو اور اسے قیام معروف اور نہی عن المنکر کی طاقت بھی حاصل ہو۔

انتخابات کی مدت بڑھانے کے سلسلہ میں ہم نے بعض حضرات سے گفتگو کی تو انہوں نے بعض اندیشوں کا مجملاً ذکر کیا، یہ ہماری سیاسی سوجھ بوجھ کا نقص ہے کہ ان کے اندیشے ہمارے فہم سے بالاتر ہی رہے، سیاست کے معاملات میں ہم اپنی ناتجربہ کاری کا اعتراف کرتے ہیں۔ عوام اور قومی اتحاد کا انتخاب کی مدت کے بارے میں جو فیصلہ ہوگا اس کو ماننا ہی پڑے گا۔ اس سلسلہ میں صرف اتنی عرض ہے کہ پاکستان کا نظم و نسق قومی اتحاد کے ہاتھوں میں آنے کے بعد اگر مجرموں کے احتساب میں دشواریاں پیش آئیں اور بھٹو کے دورِ حکومت کے خائن و بدکردار عہدے داروں نے حکومت کی مشنری میں رکاوٹیں پیدا کیں تو پھر عوام کی زبان سے یہی نکلے گا کہ کاش جنرل اقتدار کے لئے اتنی عجلت نہ کی جاتی، یہی وہ نازک مقامات ہیں جہاں تقدیر کے مقابلہ میں تدبیر کی نہیں چلتی۔ تقدیر کے نوشتہ کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

بدترین دورِ حکومت

بھٹو کا دورِ حکومت قتل و غارت گری، لوٹ کھسوٹ، رشوت ستانی، خیانت، لالچ، دھوکے اور دھاندلی کا دور رہا ہے ملک کی معیشت کو تلپٹ کر دیا گیا اور فوجی نظام کو بدکاری کی دکان بنا دیا گیا، مسٹر بھٹو نے اپنی شخصیت ذات اور اقتدار کے بے جا خواہ مخواہ اور بے ضرورت پیدا کرنے کے لئے پاکستان کی دولت کو پانی کی طرح بہایا اور لنگروں کی مانند روپیہ کو بکھیر نما اور ... "بیچے اور کھے" ... چکر اس شخص کے دور میں چلتا رہا ہے، اس حکومت میں سرکاری عہدیداروں کی خیانت و

غفلت اور بے عنوانیوں سے نہ صرف یہ کہ درگزر کیا گیا ہے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے تاکہ وہ اقتدار کے ظلم و ستم کے آلہ کار بن سکیں اور خاص طور سے انتخابات کے موقع پر ان سے کام لیا جا سکے۔ اب یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ انتخابات میں سرکاری عہدیداروں اور اہلکاروں نے بھٹو صاحب کے اشارے اور ایماء سے دھاندلی کا پارٹ انجام دیا ہے اور پیپلز پارٹی کی بڑی شد و مد کے ساتھ حمایت اور طرفداری کی ہے۔

پاکستان سے باہر جو زر مبادلہ بھیجا گیا ہے وہ بیرونی ملکوں کے بینکوں میں جمع ہے اسکی کوئی حد و شمار نہیں، تنہا "جام صادق علی" بھٹو کے دور حکومت کی لوٹ مار، خیانت اور بددیانتی کی زندہ مثال ہے، نہ جانے کتنے "جام صادق" ہیں جو اب تک اشتہاری مجرموں کی طرح چھپے ہوئے ہیں، ذوالفقار علی بھٹو اور ممتاز بھٹو کے کردار و مزاج میں بڑی یکسانی پائی جاتی ہے، دونوں آمرانہ ذہن رکھتے ہیں اور بادہ و شاہد کے رسیا ہیں، ہاں اصولاً عصبیت میں ممتاز بھٹو اپنے چچازاد بھائی ذوالفقار علی بھٹو سے میلوں آگے ہیں، ذوالفقار علی بھٹو کو پاکستان سے، سندھ سے، اسلام اور سوشلزم سے کوئی محبت اور تعلق خاطر نہیں ہے، اس شخص کو صرف اپنی ذات اور شخصیت سے محبت ہے، مسٹر بھٹو کے عزائم اور منصوبوں کا محور ان کی اپنی ذات ہے، اپنی ذاتی اغراض اور شخصی اقتدار کے لئے پاکستان کے عزت و وقار کو انہوں نے فٹ بال کی طرح استعمال کیا ہے۔

بھٹو صاحب کو نہ خوف خدا تھا اور نہ بندوں کی شرم جس کسی کو بھی اپنا مخالف پایا اس کو جس الزام میں چاہا پھانس دیا، اپنا حکم چلانے کے لئے مسٹر بھٹو نے عدلیہ کے وقار و عزت پر حملے کئے اور عدلیہ کے اختیارات کو محدود کرنے اور گھٹانے کا شرمناک ڈرامہ کھیلا، دستور میں من مانی ترمیمیں کیں جس نے جمہوری قدروں کو شدید نقصان پہونچایا، ان ترمیموں کا مقصد اپنی آمریت اور جابرانہ اقتدار کو غذا پہونچانا اور مطلق العنانی کو مستحکم اور پائیدار بنانا تھا۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا کون ذمہ دار ہے؟ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر خواجہ خیر الدین صاحب کے بیانات نے اب کسی شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا المیہ بھٹو صاحب کے اعمالنامہ کا سب سے زیادہ سیاہ ورق ہے، یہ حقیقت مبالغہ آمیز نہیں ہے کہ مسٹر بھٹو کو کسی بیرونی طاقت نے پاکستان کی تباہی و بربادی اور

اس ملک کا بیڑا غرق کرنے کے لئے مقرر (متعین) (DEPUTE) کیا۔

اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین بھی ہے اور ساتھ ہی منتقم اور شدید العقاب بھی ہے چھ برس تک مسٹر بھٹو کو اللہ تعالیٰ کے "قانون امہال" نے ڈھیل دی، جب پاپ کا گھڑا بھر گیا تو اللہ تعالیٰ کا قانون انتقام حرکت میں آ گیا اور دم زدن میں بھٹو صاحب کا تخت آمریت اوندھا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کار عظیم کے لئے جنرل ضیاء الحق کو منتخب فرمایا، بھٹو صاحب نے دو برس ہوئے اعلان کیا تھا کہ مجھ پر فوج کا دباؤ نہیں ہے "۔۔۔۔ پھر انتخابات کی دھاندلیوں کے بعد اسمبلی میں کہا کہ "فوج میرے ساتھ ہے"۔ مسٹر بھٹو کے زمانے میں جن شہروں میں مارشل لاء لگا وہاں فوج کو اپنے افسروں کا حکم پا کر گولی بھی چلانی پڑی، بھٹو صاحب اس طرح عوام میں فوج کے "امیج" کو دھندلا کرنا چاہتے تھے اور یہ بات عوام میں مشہور تھی کہ جنرل ضیاء الحق بھٹو صاحب ممنون منت اور مرہون احسان ہیں اس لئے وہ بھٹو صاحب کے حکم کو ٹال نہیں سکتے، مگر اللہ تعالیٰ نے جناب ضیاء الحق ہی سے وہ کام لیا جس نے اُن کو پاکستان کے عوام میں محبوب بنا دیا اور فوج کا امیج جو قدرے غبار آلود سا ہو گیا تھا اور زیادہ تابناک ہو گیا، مسٹر بھٹو کے دور آمریت میں جنرل ضیاء الحق صاحب کے لئے بھی شدید مشکلات تھیں وہ بے موقع اقدام کرتے تو ناکام ہو سکتے تھے، جنرل موصوف نے صورت حال کی نزاکتوں کا جائزہ لے کر مناسب و موزوں موقع پر قدم اٹھایا اور اللہ تعالیٰ کی نصرت نے اُن کا ساتھ دیا۔ اُن کا یہ کارنامہ پاکستان کی تاریخ میں زریں حروف میں لکھا جائے گا۔ جنرل ضیاء الحق یہ جرأت مندانہ اقدام نہ فرماتے تو مسٹر بھٹو کا اپنی کرسی سے ہٹنا محال تھا۔ بھٹو صاحب وزارت عظمیٰ کی کرسی پر متمکن رہتے تو ہزار تحفظات کے باوجود انتخابات میں دھاندلیاں ہوتیں۔۔۔۔ ہاں! ۔۔۔۔ اس کا اعتراف ضرور ہے کہ متحدہ محاذ کی طوفانی تحریک احتجاج اور عوام کی قربانیوں نے بھٹو کے خلاف ملک میں جو فضا پیدا کی تھی مارشل لاء کے لئے وہ فضا ساز گار ثابت ہوئی۔

مسٹر بھٹو نے اپنے دور آمریت اور عہد جبر و استبداد میں بے گناہوں کو جھوٹے مقدمات میں پھانسا اور ان پر جھوٹے الزامات لگائے عدالت کسی ملزم کو بری کر دیتی تھی تو اس بیچارے ناکردہ گناہ ملزم کو کسی دوسرے بناوٹی الزام میں دھر لیا جاتا تھا۔۔۔ مگر مسٹر بھٹو کے ساتھ مارشل لاء نے ذرہ برابر زیادتی نہیں کی، بھٹو صاحب آج جہاں ہیں وہ اسی مقام

کے مستحق تھے۔ تاریخ کسی ایسے سربراہ حکومت کا پتہ نہیں دیتی جسے اتنے بہت سے خوفناک الزامات میں ماخوذ کیا گیا ہو اور جس کا دامن کردار اس قدر داغدار رہا ہو، اُن کے ہسٹری شیٹ کی بہت سی جھلکیاں اخبارات میں آ چکی ہیں۔

پاکستان کی خواتین کو اس کا استحقاق حاصل تھا کہ وہ نصرت بھٹو کا معاشرے میں منصب اور مقام متعین کرتیں، خواتین کے اس استحقاق کو بھی مسٹر بھٹو نے چھین کر اپنی آمریت اور اقتدار کے زور پر اپنی بیوی کو "خاتون اوّل" کا منصب بلند دے دیا، پاکستان کی عام خواتین جو اسلامی حجاب و حیا کے تقاضوں کو پہچانتی ہیں، انہوں نے نصرت بھٹو کی تحسین نہیں کی اور نہ ان کی قیادت کو پسند کیا۔ بھٹو کے دور حکومت میں جو "ہفتہ خواتین" منایا گیا تھا، اس میں طالبات کے ناچ گانے کی محفلوں کی صدارت اور سرپرستی نصرت بھٹو فرماتی تھیں، "ہفتہ خواتین" مسٹر بھٹو اور مسز بھٹو کے عزائم کا مظہر تھا کہ دونوں میاں بیوی پاکستان کی عورتوں کو کیا سکھانا اور کیا بنانا چاہتے تھے، بھٹو صاحب کی ساختہ پرداختہ "خاتون اول" کو آج پاکستان کی پردہ نشین خواتین کی صف پائیں میں بھی مشکل ہی سے جگہ مل سکتی ہے نصرت بھٹو نے اپنے شوہر نامدار کی طرح اپنے مقام و منصب کا بھی زوال دیکھ لیا ہے

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافات عمل غافل مشو

محترمہ نصرت بھٹو، مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو مظلوم بنا کر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی مضحکہ انگیز کوشش کر رہی ہیں، مسٹر بھٹو کے دور آمریت میں جن سہاگنوں کا سہاگ اجاڑا گیا تھا، جو بچے یتیم ہوئے تھے، جن معصوم طالبعلموں کے شرمناک زیادتیاں کی گئی تھیں، جن علماء کی داڑھیاں نوچی گئی تھیں، جن عورتوں کو اس خطا پر حوالات اور قید خانہ میں رکھا گیا تھا کہ ان کے شوہر یا بھائی مسٹر بھٹو کے نزدیک ناپسندیدہ تھے ۔۔۔ اُس وقت "خاتون اول" نے ان مظلوموں کی حمایت میں ایک حرف بھی نہیں کہا۔

قاتلوں، رہزنوں، چور اُچکوں، گرہ کٹوں، اور خیانت کرنے والوں سے جو کوئی ہمدردی رکھتا ہے تو وہ پرلے درجہ کا ضمیر فروش اور حق ناآشنا ہے ۔۔۔ وہ آدمی ہی کیا جو ظالم اور مظلوم میں فرق و امتیاز نہ کر سکے، اور اس کے سامنے صرف عقیدت و سزا کا منظر ہو اور یہ بات اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ہو کہ جس مجرم کو سزا دی جا رہی ہے اُس کا جرم کتنا خوفناک ہے۔

خط و کتابت کے وقت اپنا پتہ صاف اور خوشخط تحریر فرمائیں۔
(منیجر)

بقیہ صفحہ ۹

دنعت لیا، لیکن میرے جلے ہوئے دل، میرے زخمی دل کی آہ اور کراہ سمجھئے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی، میں خدا کے سامنے یہ شہادت دے سکتا ہوں کہ میں نے سب سے بڑے صنم خانے میں اذان دی، میں نے تیرا نام لیا اور اس کے لئے موزوں سے موزوں تر جو مقام ہو سکتا تھا وہاں میں نے یہ پیغام پہونچا دیا، میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ میں سے ایک شخص نے بھی قبول کیا تو میں کامیاب ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے کام سے بھی زیادہ دین کا کام لے اور آپ کو اپنے اور اپنے خاندان ۔۔۔ سے کہیں زیادہ دین اور اسلام کے لئے مفید اور خود اس ملک کے لئے مفید بنائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ابو تمام اور اس کی شاعری

محمد صدر الحسن درجہ ہفتم عربی

★

انسان اپنے زمانہ کی پیداوار ہوتا ہے، اس مقولہ میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا یعنی انسان اپنے زمانہ کے عام فکری اور علمی مستوی سے بلند نہیں ہوتا۔ کیونکہ جن عناصر سے اس کی شخصیت پروان چڑھتی ہے وہ عناصر ہر ایک کی شخصیت سازی میں یکساں عمل کرتے ہیں لیکن کلیات میں مستثنیات بھی ہوا کرتے ہیں اور حقیقت بھی ہے کہ ہر دور میں کچھ ایسی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں جن کا مستوائے علمی عام سطح سے بہت بلند رہا ہے۔ چاہے حدیث کا میدان ہو یا فقہ کی جولانگاہ یا تفسیر کی دشوار گذار راہ ہو یا ادب و شاعری کی پرخار منزل۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تیسری صدی ہجری افق شاعری پر جو چند شخصیتیں نمودار ہوئیں ابو تمام ان کا سرخیل تھا۔

ابو تمام کی پیدائش ۱۹۰ھ میں دمشق کے جاسم نامی دیہات میں ہوئی لیکن پرورش و پرداخت مصر میں ہوئی اور وہیں برسوں تک جامع عمرو میں جرہ برداری کا مشغلہ رہا، چونکہ طبیعت بچپن ہی سے علم و ادب کی جانب مائل تھی اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی کم سنی کے باوجود علماء فن کی مجالس میں شریک ہونا اور ان کے علمی و فنی مباحث سے مستفید ہونا معمول بن گیا۔ یہاں تک کہ مورخین کا بیان ہے کہ اس نے قصائد و مقطوعات ۱۴ ہزار ارجوزہ حفظ کر لئے۔ اس طرح علم و ادب اور شعر و شاعری کے کوچے میں ابو تمام کا یہ پہلا قدم تھا۔

ابو تمام اپنی ذہنی ساخت اور فکری نشو و نما کے اعتبار سے کافی بلند معیار رکھتا، اس لئے مصر کی سرزمین بھی اس کے تخیلاتی بحر ناپید کنار کا ساتھ نہ دے سکی، اگر حقیقت ہے کہ مصر ہی میں اس کے اندر ادبی پختگی اور شاعری کا ذوق جمیل پیدا ہوا تھا، اس لئے اس نے شام کی راہ اختیار کی۔ وہاں وہ چند سالوں تک روساء اور اعیان سلطنت کی مدح سرائی میں زمزمہ سنج رہا جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی شہرت افق شام سے شفق جزیرہ و عراق تک پہونچی اور فرمانروائے عراق نے اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ یہاں بھی وہ اپنی شیریں بیانی اور نکتہ آفرینی سے شاعری کی فلک بوس عمارت کا مکین بن گیا اگرچہ کلام شعراء قدغن کا کام انجام دے رہے تھے۔ اسی طرح شعر و شاعری کی گلی سے معتصم کے دربار تک بھی رسائی ہوئی۔

ابو تمام کوچہ شاعری کا شناسا اور بحر افکار کا شناور تھا۔ اگر وہ ایک طرف بحر معانی کا غواص تھا تو دوسری طرف فصاحت و بلاغت کا مرد میدان بھی تھا، اگر وہ ایک طرف کثرت حفظ کی دولت سے مالا مال تھا تو دوسری طرف الفاظ و معانی کی ہم آہنگی میں اپنی مثال آپ تھا، اگر ایک طرف حاضر جوابی کا خود مختار بادشاہ تھا تو دوسری طرف شہسوار معانی کا قمری بھی تھا، اگر ایک طرف اس کی جوانی مانند سحر بے داغ تھی تو دوسری طرف اس کے بحر خیالات کا پانی کافی گہرا تھا۔

شراح نے اس کی حاضر جوابی کے عجیب و غریب واقعات لکھے ہیں۔ بے جا نہ ہوگا کہ بازار شعر و شاعری میں اس متاع بے بہا کو بھی پیش کیا جائے تاکہ دونوں کے امتزاج سے دو آتشگی پیدا ہو۔ ابو تمام نے جب امیر احمد بن معتصم کی تعریف میں قصیدہ پڑھنا شروع کیا، اور اس مصرع پر پہونچا ؎

إقدام عمرو في سماحة حاتم
في حلم أحنف في ذكاء إياس

تو فیلسوف عرب ابو یوسف یعقوب کندی نے کہا کہ امیر تمہاری اس تعریف سے برتر ہے تبھی اس نے اپنی گردن جھکائی اور اسکے بعد کہا

لا تنكروا ضربي له من دونه
مثلا شرودا في الندى والباس
فالله قد ضرب الأقل لنوره
مثلا من المشكاة والنبراس

حاضرین کا بیان ہے کہ جب اس کے ہاتھ سے قصیدہ لیا گیا تو اس میں دونوں مصرعے موجود نہیں تھے۔

حاضر جوابی کی ایک اور نادر مثال بھی سننے کے قابل ہے۔ جب ابو تمام نے والیٔ خراسان امیر عبد اللہ بن طاہر کی شان میں قصیدہ پڑھے تو ابو العمیثل نے جو اپنے زمانے کا نامور شاعر اور شعراء سلطنت کے ندیموں میں سے تھا، کہا لِمَ لا تقول ما يُفهم تو ابو تمام نے فوراً کہا لِمَ لا تفهم ما يقال۔

ابو تمام نے ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی اور اپنے معاصروں سے بہت آگے بڑھ گیا لیکن جو بلند مقام اس نے مرثیہ گوئی میں حاصل کیا اس کا کوئی شاعر تمنا بھی نہ کر سکا۔ مراثی میں اس کا مشہور قصیدہ وہ ہے جس میں اس نے محمد ابن حمید طوسی کی مرثیہ خوانی کی ہے۔

دیوان حماسہ

ابو تمام کو جس چیز نے حیات جاوید عطا کی وہ اس کا وہ کارنامہ ہے جو "دیوان حماسہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں دور اسلامی اور دور جاہلی کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے، اس مختار کا اصل نام ابو تمام نے "الاختیارات من شعر الشعراء" رکھا تھا جس کا پہلا باب "حماسہ" سے شروع ہوتا ہے لیکن کثرت مقبولیت اور عرب کے عام مزاج سے ہم آہنگی کی بنا پر یہ کتاب ہی حماسہ کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اس کے دوسرے ابواب مراثی، ادب، تشبیب، ہجاء، اضافات، صفات، سیر، مذمۃ النساء پر مشتمل ہیں۔ اس حماسہ سے متاثر ہو کر آٹھ حماسے اور عالم وجود میں آئے لیکن جو شہرۂ آفاق مقبولیت اسے حاصل ہوئی کسی اور کے حصے میں نہ آئی۔

دیوان حماسہ کی اہمیت صرف اسی بنا پر نہیں ہے کہ وہ شعراء کے کلام کا ایک مجموعہ ہے بلکہ اس لئے بھی ہے کہ وہ اس وقت کی عرب معاشرت و تمدن اور رسم و رواج کا آئینہ دار ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عہد جاہلیت میں عرب تہذیب و معاشرت سے عاری تھے اور بیسویں صدی کی طرح اس زمانے میں وہ وسائل اور ذرائع نہ تھے جن کی دلکشی انسانوں کو اپنی جانب مائل کرتی اسی پر بس نہ تھا کہ وہ لباس، غذا اور طرز معاشرت میں بھی تمدن سے بہت دور تھے اور قدرت نے بھی اس ملک میں سادگی ہی رکھی تھی۔ قرآن نے بھی وادی غیر ذی زرع سے ہی تعبیر کیا ہے۔ نہ وہاں رنگینیاں تھیں اور نہ پھول کے قطار، نہ یاسمین و نرگس کا چمن تھا اور نہ لالہ و گل کے دلکش مناظر، لہلہاتے آب و گیاہ، ریگستان تھا، جہاں جا بجا پہاڑیاں اور ریت کے تودے تھے، نہ وہاں قمری و بلبل کے دلکش نغمے تھے اور نہ پپیہا اور فاختہ کی پرسوز بولی تھی بلکہ اونٹوں کی بلبلاہٹ اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ ہی ان کے لئے نغمۂ ساز تھی اور ان کی شاعری گویا تار ساز پر مضراب کا عمل کیا کرتی تھی۔ ان حالات میں ان کے اندر رنگینی و لطافت کی تلاش عبث ہے بلکہ ہمیں اس سے بلند ہو کر یہ سوچنا ہوگا کہ اس زمانہ کے تمدن اور ماحول کے لحاظ سے ان کی شاعری کس درجہ کی حامل تھی۔ ظاہر ہے کہ انکے سامنے کھجور اور ببول کے خاردار درختوں اور چند وحشی جانوروں اور چند سواری کے چوپایوں کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے وہ اپنی نظروں کو سکون بخشتے۔

اب ان حالات اور ماحول کو پیش نظر رکھئے اور حماسہ پر نظر ڈالئے اور غور کیجئے کہ شاعر نے کس خوش اسلوبی سے منظر کشی کی ہے اور شعر کا حق ادا کیا ہے لہذا اگر ان کی شاعری میں لطیف و نازک تشبیہیں نہیں ہیں تو اس سے ان پر حرف نہیں آتا۔ اصل دیکھنا یہ ہے کہ جو کچھ ان کے سامنے تھا اسے انہوں نے جامۂ شعری کس طرح پہنایا۔ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں مثالیں پیش کرتا اور اس کی لفظی اور معنوی خوبیوں پر بحث کرتا اور ان اوصاف کو بیان کرتا جن اوصاف نے ان کی شاعری میں چار چاند لگائے۔

حماسہ کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ جب ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو عرب کے اخلاق و عادات، انفرادی طرز معاشرت اور تمدنی زندگی کی حقیقی اور اصلی تصویر نظروں کے سامنے کھنچنے لگتی ہے اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ سخاوت و شجاعت، جو انمردی و دلیری ان کے خاص اوصاف تھے اور یہ جوہر ان کے ہر ہر فرد میں اس طرح نمایاں تھا جس طرح سیاہی میں سفیدی نمایاں ہوتی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ محبت و شفقت، حمیت و غیرت، مہمان نوازی، عزت نفس، حق شناسی، راست گوئی و حق گوئی، قوت حافظہ، سرعت فہم، حاضر دماغی اور حاضر جوابی کے حقائق اور روشنی کی طرح نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں، اور ان کی شاعری ان تمام چیزوں کو نمایاں کر دیتی ہیں لیکن اگر یہ دیوان نہ ہوتا تو شاید ہم ان چیزوں سے بہت حد تک نابلد ہوتے۔

یہ ظاہر ہے۔ ۔۔۔ اُمّی تھے تعلیم و تعلم کا وہ سلسلہ نہ تھا ۔۔۔ ہے ان دو رنگینیوں کا مرکز تھے، نہ فلسفی کا کوئی شعبہ

تھا اور نہ ایسی ڈگریاں حاصل کرتی تھیں اور نہ ان کے لئے ثقافت کے درس سے مستفید ہونے کے لئے کسی درسگاہ کا انتظام کیا گیا تھا لیکن اسکے باوجود شاعری کے لئے جو چیزیں ازبس ضروری تھیں ان کو روانی کے ساتھ حاصل تھیں، اسی لئے وہ جذبات انسانی اور مناظر قدرت کی ایسی سچی تصویر کشی کرتے ہیں جو ایک اعلیٰ تعلیمیافتہ کے لئے بسا اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔ اسکے نمونے بھی اس دیوان میں بکثرت ملتے ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عرب جنگ جو اور جدالی آپ تھے اور بقول مفکر عالم حضرت العلام سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی "جنگ ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی" ... لیکن جیسا کہ عام طور سے مشہور ہے کہ ان کی تمام لڑائیاں عبث و بے سود اور نخوت و تکبر اور خود رائی کا نتیجہ ہوتی تھیں صحیح نہیں ہے بلکہ اس دیوان کے مطالعے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی بہت ساری لڑائیاں عزت و ناموس کی حفاظت کے لئے ہوئی ہیں۔ عرب ہر چیز برداشت کر سکتے تھے لیکن عصمت اور بے آبروئی کسی قیمت پر برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ علامہ اقبال کی زبان میں "خودی" کی حفاظت میں عرب اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے اس کی بھی نشاندہی ہزاروں اشعار سے ہوتی ہے۔ پھر میں وہی جملہ دہراتا ہوں کہ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو سیکڑوں اشعار نقل کر کے اپنے اس دعویٰ کو دلیل سے مزین کرتا لیکن . . . . . .

آج کے دور میں مبالغہ آمیزی شاعری کا ایک جزو خاص "یا" عنصر لاینفک" بن گیا ہے اور "اعذب الشعر اکذبہ" والی کہاوت بالکل صادق آگئی ہے لیکن عرب اس سے بالکل مبرا تھے وہ صورت کشی اور منظر کشی میں حقیقت سے دور نہیں ہوتے تھے بلکہ حقائق کو جامہ شعری پہنا دیتے تھے اور اس طرح پیش کرتے تھے کہ آج ہزاروں سال کے باوجود اشعار پڑھتے وقت وہ مناظر نظروں کے سامنے آجاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی یہ اشعار کہے گئے ہیں۔

آج دنیا کو تہذیب و تمدن کے بام عروج تک پہونچنے کا دعویٰ ہے اور چاند پر کمندیں ڈالنے کے بعد مریخ، عطارد اور زحل تک رسائی کی فکر میں ہے لیکن اس کے باوجود پردہ کی مخالف ہے لیکن عرب ... کہ وہ بدوی جنہیں مدنیت کی بو بھی نہیں لگی تھی اور بالاتفاق انسانیت فراموشی اور خدا فراموشی کی انتہائی منزل پر تھے پھر بھی انکی نگاہ میں پردے کی اہمیت تھی یہ حقیقت بھی دیوان حماسہ سے واشگاف ہوتی ہے۔ عروین معدیکرب کہتے ہیں ...

(اور لیس (شاعر کی بیوی) ظاہر ہوئی گویا کہ وہ جو ہر پیز تھی جب وہ ظاہر ہوا اور اس کی دیر ... پنہاں خوبصورتی پنہاں ہو گئی اور معاملہ بہت ہی نازک ہو گیا۔

الغرض دیوان حماسہ کی اہمیت بیان کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے لیکن مختصرا اس نے بیان کیا تاکہ اجمالی اہمیت نظروں کے سامنے آجائے۔

شاعری میں ابو تمام کا مقام:

تیسری صدی میں چند نامور شعرا پیدا ہوئے جن کی حیثیت کوچہ شاعری میں قدم رکھنے والوں کے لئے کہکشاں کی تھی۔ ان میں ابو عبادہ بحتری ابن الرومی، ابن المعتز اور ابو تمام کا نام آفتاب لیکن ناقلین ادب کا کہنا ہے کہ،

کان ابو تمام راسھم وامامھم وزعیم المحدثین فی التجدید الشعری فی القرن الثالث الھجری۔

ابو تمام اور ابن الرومی اگرچہ فکری حیثیت سے ہم پلہ تھے اور دونوں کے دل کی صراحی افکار سے لبریز تھی اور ان کے بحر تخیلات کے کنارے ناپید کنار تھے لیکن ابو تمام کو جو چیز ابن الرومی سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی فنی اور علمی دقیقہ سنجی اور اس کے مطابق الفاظ کا انتخاب ہے۔ اس کے برخلاف ابن الرومی بحر معانی کا غواص تو ضرور ہے لیکن اسالیب کلام اور الفاظ کے نشیب و فراز اور اس کے اندر ہونے والے مد و جزر کا قتیل نہیں ہے۔ ابو عبادہ بحتری اپنے خیالات و افکار میں اپنے استاد ابو تمام کے مدرسہ فکر سے بہت کچھ متاثر ہے لیکن اس کے باوجود وہ کلام میں اسقدر صنعت کا قائل نہ تھا جو عام عربی فطرت کے مطابق اور خالص ادبی ذوق کے مناسب ہو۔ ابن المعتز اگرچہ الفاظ و معانی کی ہم آہنگی اور صنعت الفاظ میں ابو تمام سے کسی طرح کم نہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ ان افکار سے پہلو تہی کرنا بہتر نہیں سمجھتا جس کی طرف اس کی عقل رہنمائی کرتی ہے اور مزید برآں یہ کہ وہ اس ثقافتی رنگ سے دامن نہ بچا سکا جو اس دور کے عام انسانوں کی عقلی زندگی سے پیوست ہو گیا تھا۔

ابو تمام کے فضل کے اعتراف کے لئے ناقلین ادب کا یہ جملہ کافی ہے کہ "انہ احتل فی زمانہ خمانہ شاعر کلھم مجید" اس کے علاوہ بھی ناقدین کلام کی کتابیں اس کے فضل و کمال سے بھری پڑی ہیں ... میں اس عظیم شاعر کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

... تب کہا کرتے ہیں ...

بقیہ: ... نفی و کان الامر حتما!

عید آئی ہے تقریب سعید آئی ہے

مفتوں کوٹوی

(رُباعیات)

عید آئی ہے مسجد میں صف آرائی ہے
توفیق ملی بہر عبادات صیام
اظہار تشکر میں جبیں سائی ہے
اللہ سے امید پذیرائی ہے

روزہ میں نہاں صبر و رضا و طاعت
یوں تربیت روح و بدن ہے مقصود
ہے جان کی اور جسم کی اس میں رفعت
دارین کے ہر موڑ پہ پائے عظمت

اس ماہ میں صدقات کی ہوتی ہے بہار
ہر وقت ہے بندے کی خدا پر نظریں
ضبط اپنے لئے۔ اوروں کے حق میں ایثار
ہے مائل اکرام۔ خدائے غفار

روزہ ہے فقط بہر خداوند جہاں
ہر عضو کو رکھتا ہے گنہ سے محفوظ
بندے میں خدا میں ہے یہ اک ربط نہاں
بندے کو یقیں ہے کہ خدا ہے نگراں

ہے تجزیہ قول و عمل کا یہ ماہ
تقویٰ وہ خداوند تعالیٰ بخشے
لازم ہے کہ ہو تزکیہ قلب و نگاہ
آسان ہو ہر منزل دارین کی راہ

کیا سمجھے کوئی عظمت ماہ رمضاں
صد شکر ملا رہبر ہر شعبہ زیست
اس ماہ میں بخشا گیا ہم کو قرآں
قرآن ہے دستور حیات انساں

روزوں میں ہر اک خیر کا ہے اجر عظیم
بندوں کو ہے ترغیب نکوکاری بھی
مائل بہ کرم رہتا ہے وہ رب کریم
کچھ اس میں اذیت ہو تو سمجھیں نہ سقیم

روزہ ہے منشا۔ تو حصول تقویٰ
ہو یہ نہ اگر۔ فائدہ کیا روزہ سے
ہر عضو بدن رکھے اگا محفوظ خطا
بس جوع و عطش ہی نہیں مطلوب خدا

ہو صدقہ و خیرات کہ فطرہ یا زکات
حاصل ہوں غریبوں کو بھی زریں لمحے
زردار کو ہو بخل طبیعت سے نجات
ہر فرد و بشر کی یوں چمک جائے حیات

زردار کہ ہر شے پہ ہے جن کا مقدور
کیا پیاس ہے، کیا بھوک ہے، وہ بھی تو سہیں
برداشت کریں روزہ کے ممنوعہ امور
نظروں میں رہیں ان کی غریب و مزدور

افعال جو روزوں میں مقرر ہیں حرام
ہو بزم کہ تنہائی یہ ہے ذہن میں بات
پاس ان کے نہیں جاتے خواص اور عوام
ہے حاضر و ناظر وہ خداوند انام

دن روزہ کا ہے، شام کو افطاری ہے
افطار و سحر، صوم صلوٰۃ و فطرہ
ہے صبح "سحر" رات کو بیداری ہے
کچھ اپنی ہے کچھ اوروں کی دلداری ہے

مل جل کے لئے سب نے عبادت کے مزے
مسجد ہو محراب کہ گھر کا گوشہ
تنہائی میں حاصل ہوئے طاعت کے مزے
اللہ رے قرآں کی تلاوت کے مزے

ہر ضبط کی روزوں میں پذیرائی ہے
پانے میں رہا ظاہر و باطن کیسے
پھر عید سے تعلیم دل آرائی ہے
ہاتھ اپنے یہ تدبیر مفید آئی ہے

مہکی ہوئی خوشیوں کی نوید آئی ہے
احباب کو مفتوں کا سلام اخلاص
سمٹی ہوئی کیا خواہش دید آئی ہے
عید آئی ہے تقریب سعید آئی ہے

از: جناب ریاض الدین احمد صاحب (سابق پرنسپل مجیدیہ اسلامیہ کالج الہ آباد)

شراب ——— طبّی تجزیہ

(قسط ۲)

گذشتہ شمارہ میں ہم نے شراب پر روحانی اور اخلاقی پس منظر میں روشنی ڈالی جا چکی۔ اب سائنسی اور طبّی پس منظر سامنے آ رہا ہے تاکہ اللہ کی مصلحت کاملہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث صادق پر یقین محکم کی تہیں جم جائیں۔

(۱) سائنسی دریافت کی ابتدا:

شراب کے مضر پہلوؤں سے دنیا کبھی بے خبر نہیں رہی ہے۔ اس لئے صالح مزاج انسانوں کے طبقے میں شراب کی مذمت ایک تاریخی حقیقت ہے۔ لیکن اطبائے وقت نے شراب کے متعلق نئی دریافتوں کا جو سلسلہ جاری کیا، اس کی ابتدا ۱۹۵۹ء سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر چارلس لی برگ کی نو سالہ جستجو اور جد و جہد خاص اہمیت کی مالک ہے۔ انہوں نے شرابی کے جگر پر اثرات کا جائزہ لیا۔ دوسرے ماہر فن ڈاکٹر جیک منڈلسن نے دل پر اس کے اثرات کو معلوم کیا ڈاکٹر ڈان واکر اور ڈاکٹر گرہارڈ فرد ینڈ نے اس کے دماغ پر مرتب ہونے والے اثرات سے خبردار کیا۔ اور ڈاکٹر فرانسس نے شرابی کی مجموعی شخصیت پر روشنی ڈالی۔ ان حضرات کو آرتھر سے نیویارک ٹائمس میگزین شمارہ ۱۸ مئی ۱۹۷۵ء میں ایک مقالہ لکھ کر پیش کیا ہے جو بعدہ ریڈرس ڈائجسٹ میں شائع ہوا۔ اس مقالے نے جو عجیب و غریب انکشافات کئے ہیں وہ احکامات قرآنی کے لحاظ سے حرمت شراب کے لئے عقلی اور سائنسی دلیل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان انکشافات کو قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے پیش کر دینا خالی از افادیت نہ ہوگا۔

(۲) شراب کے اثرات جگر پر:

ڈاکٹر چارلس لیبر (Charls Lieber) جو امریکہ میں امراض جگر کے مشہور ماہر ہیں شراب کے جگر پر اثرات کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "زائد از ضرورت چربی کو جلانا جگر کے فرائض میں داخل ہے۔ مگر شراب جگر کے اس اہم فعل کو روک دیتی ہے۔ نتیجے میں شراب پینے والا اکثر ہیپاٹائٹس (Hepatitis) کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

جرمنی کے ڈاکٹر لیل بیچ (Lel Lach) اور فرانس کے ڈاکٹر جارجس پیکولی نائٹ (Georgs Paquignot) نے اعداد و شمار کے جائزے سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وسکی کا آدھا لیٹر یومیہ اگر کوئی ۲۵ برس تک پیتا رہے تو اغلب ہے کہ وہ اسے شدید امراض جگر میں مبتلا ہو جائیگا جیسے تحجر جگر (Fatty Liver)

(۳) شراب کے اثرات دل پر:

ڈاکٹر جیک منڈلس (Dr. Jack Mendelson) جو بک ین ہسپتال میں ڈائرکٹر برائے مضر منشیات اور ہارورڈ میڈیکل کالج کے پروفیسر ہیں دل پر شراب کے تاثرات کے متعلق اپنی تحقیقات اور تجربات کے نتائج کا خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں:

"شرابیوں کے دل پر کئی طرح کے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کے خون کی سطح میں خطرناک تبدیلی کی وجہ سے دل کی رگوں کو شدید نقصان پہونچتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے شراب کا قطعی چھوڑ دینا ہی بہترین علاج ہو سکتا ہے۔ دوسرا خراب اثر جو دل پر شراب کی وجہ سے پڑتا ہے وہ دل کے پٹھوں کا کمزور ہو جانا ہے۔ اس کی وجہ سے کیلشیم (Calcium) کو چھوڑنے اور پکڑنے کا جو اہم کام دل کے بعض خلیے کرتے رہتے ہیں اس میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور دل اپنا فعل صحیح طور پر انجام دینے سے قاصر ہو جاتا ہے یہ خطرناک اعصابی بیماری کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

(۴) شراب کا اثر دماغ پر:

دو محققین ڈاکٹر ڈان واکر (Don Walker) اور ڈاکٹر گرہارڈ فرویڈ (Gerhard Freund) نے ۱۹۷۳ء میں رسالہ "سائنس" میں ایک مقالہ شائع کر کے تمام دنیا کو خبردار کیا کہ "شراب دماغ کے مرکزی نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے" اس لئے اس سے پرہیز کرنا ہی حفظان صحت کے لئے ضروری ہے۔

دوسرے محققین کا گروپ جس میں ڈاکٹر سوجاتا توری اور دیگر ماہرین مقیم امریکہ اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ "انسان کے جسم میں دماغ سب سے زیادہ متحرک عضو ہے اور یہ ہر وقت چھوٹے مالیکیول (Molecule) کو بڑے مالیکیول بنانے کا ایک حصہ میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ ان کے میل سے دماغ میں سنئے خلیے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی دماغی افعال مثلاً یادداشت کو قائم رکھنے میں مدد دیتے ہیں، شراب کے استعمال سے ان نئے خلیوں کی پیداوار رک جاتی ہے اور یادداشت زائل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ان گروپ کا یہ اندازہ ہے کہ اگر کوئی شخص تین پیگ جن شراب ۲۰ سے ۳۰ برس تک پیتا ہے تو اس کی پرانی یادداشت اور نئی باتوں کو دماغ میں محفوظ رکھنے کی طاقت زائل ہو جائے گی۔ اور اگر شراب خالی پیٹ میں لی جائے تو وہ فوراً خون کی نالیوں میں دوڑ جاتی ہے۔ اس سے جلد تر یادداشت کا نظام بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے بہت پہلے ہی شراب کو "خامر العقل" (عقل کو ڈھانک دینے والی) بتلا چکے ہیں۔

(۵) شرابی کی شخصیت:

ڈاکٹر فرانسس کرٹس (Dr. Francis Curtis) پروفیسر مشگن یونیورسٹی، اور ڈاکٹر جارج میلنسن (George Mallinson) اسی یونیورسٹی کے ویسٹرن کالج آف ایجوکیشن کے پروفیسر نے اپنی کتاب "سائنس روزمرہ کی زندگی میں (Science in daily Life) شرابی کی مجموعی شخصیت کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"سائنسی شہادتیں شراب خوری کے خلاف فیصلہ کن ہیں۔ پھر بھی اکثر لوگ شراب کو بے ضرر سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحبان بھی بعض حالات میں خصوصاً بہ حالت ضعف شراب کے استعمال کا مشورہ دیتے ہیں لیکن سائنسی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ شراب کا استعمال کسی حالت میں بھی نقصان سے خالی نہیں ہے۔

اب اس میں کوئی شک باقی نہیں رہا کہ شرابی ذہنی اور جسمانی طور پر نارمل نہیں رہ سکتا، اس کی شخصیت بُری طرح مجروح ہو جاتی ہے۔ اس کے سوچنے کا انداز مریضانہ ہو جاتا ہے اس میں صحیح فیصلے کی اہلیت باقی نہیں رہتی، وہ اپنے طرز عمل پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ وہ بیجا قہقہے اور تیز گفتگو سے لوگوں کو عاجز کرتا ہے اس کے ہاتھ پیر سُن ہو جاتے ہیں اور بدن لڑکھڑاتا رہتا ہے۔ بالآخر وہ ایک مریض انسان ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسلام کا طرز عمل:

شراب کے متعلق اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ایمان اور شراب خوری کی عادت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔ (رواہ النسائی)

اس لئے اسلامی نظام حکومت شرابی کے ساتھ سختی برتا اور کڑی سزا دیتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شرابیوں کو ہاتھوں، جوتوں اور چھڑیوں سے پیٹنے کی سزا دی جاتی تھی۔

(ابن ماجہ)

حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں چالیس کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی یہی سزا حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی قائم رہی لیکن امیر المومنین حضرت عمرؓ کرسی خلافت پر صرف ایک حکمراں کی حیثیت سے نہیں تھے بلکہ رازدان نبوت بھی تھے، اس لئے ان کی دور بین آنکھیں ان تمام حقائق کو دیکھ رہی تھیں جو آج سائنس کھول رہی ہے۔ ایسی حالت میں شراب کے بارے میں ان کی متشدد پالیسی ایک زبردست حفاظتی پالیسی کی حیثیت رکھتی تھی جو اس زمانے کے لئے جتنی اہم تھی اس سے کہیں زیادہ آج بھی ضروری ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب ثقیف کے ایک شخص کے متعلق یہ خبر ملی کہ وہ خفیہ طور پر شراب بیچتا ہے تو حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکی دکان جلا دی گئی ——— ایک دوسرے موقع پر ایک گاؤں اس لئے جلا دیا گیا کہ وہاں خفیہ طور پر گھروں میں شراب کی کشید ہوتی تھی۔

کلام الٰہی، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے اسلام کے طرز عمل اور سائنسی تحقیقات سے اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ شراب ایک بدترین روحانی، سماجی اور جسمانی بیماری سے کم نہیں ہے۔

اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے حرام کر کے پوری انسانیت پر اپنی رحمت کاملہ کا نزول فرمایا ہے۔ اب جو روگردانی کرتا ہے وہ خدا دشمن، سماج دشمن اور خود اپنا دشمن ہے اور انسانیت کے جسم کا وہ کینسر ہے جس کی صحبت دنیا اور عقبیٰ میں سب کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے کھود دی گئی ہے۔

براہ کرم! مضامین صاف اور خوشخط ارسال کریں۔

پرنٹر پبلشر ... سید ... نے ... پریس ... میں طبع کرا کر دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع کیا۔
(ایڈیٹر) ...

TAMEER-E-HAYAT

Fortnightly

(NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)

ایک اہم اپیل — برائے — دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ)

دارالعلوم ندوۃ العلماء عالم اسلام کا مشہور دینی وعلمی مرکز ہے جو ستّہتر سال سے علم دین کی خدمت انجام دے رہا ہے، اور الحمدللہ کہ اسکے فضلاء ہندوستان اور بیرون ملک میں علمی و دینی خدمات انجام دے رہے ہیں یہ حقیقت نہایت قابل توجہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر طرح کی فلاح وبہبود ان کے اس دین سے وابستہ ہے جس کو لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔

مسلمان جسقدر اس حقیقت کی طرف توجہ کریں گے اور جس قدر دینی کاموں میں دلچسپی اور بلند ہمتی سے حصہ لیں گے اسی قدر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکی حفاظت وکامیابی کا فیصلہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا)۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں ایسے دینی وعلمی اداروں کا استحکام نہایت ضروری ہے، جو اسلام کی اشاعت و حفاظت اور مسلمانوں میں علم دین کی اشاعت کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ الحمدللہ کارکنان دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی اسی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ اخلاص اور قبولیت سے نوازیں۔

اس وقت دارالعلوم میں ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے علاوہ جنوبی افریقہ، شمالی افریقہ، ملیشیا، نیپال وغیرہ کے طلباء بھی زیر تعلیم ہیں۔ طلباء کی مجموعی تعداد مع ابتدائی درجات ومکاتب شہر (۱۳۰۰) ہے اس سال غیر مستطیع طلبہ کو تقریباً ڈھائی لاکھ روپیہ کے وظائف دیے گئے، حضرات مدرسین واسٹاف کی مجموعی تعداد ۴۴ ہے۔

اس وقت ندوۃ العلماء کے سالانہ مصارف مع تعمیرات تقریباً دس لاکھ روپئے ہیں ادھر کئی سال سے جگہ کی قلت کی وجہ سے طلباء کیلئے مناسب اقامتگاہوں کی فوری ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر ایک جدید دارالاقامہ اور اس سے متعلق ضروری عمارتوں کی تعمیر کا کام شروع کردیا گیا۔ دارالاقامہ کے ایک کمرے پر دس ہزار روپئے صرف کا تخمینہ ہے۔ اجتماعی بڑے کام بغیر تعاون کے انجام نہیں پاتے۔ ہمارے مسلمان بھائیوں کو اس اہم کام میں فیاضی اور حوصلے سے توجہ کی ضرورت ہے۔ خصوصاً رمضان المبارک صحیح روایات کے مطابق ہر عمل کا ثواب ستّر گنا ملتا ہے۔ علم دین اور طالبان علم دین پر جو مسلمانوں کی پاک کمائی خرچ ہوگی انشاء اللہ وہ آخرت میں اجر عظیم اور دنیا میں خیر وبرکت کی باعث ہوگی۔ ہم تمام مسلمانوں اور خصوصاً اہل استطاعت سے گذارش کرتے ہیں کہ حسب حیثیت فراخدلی سے دارالعلوم کی مدد فرماکر عنداللہ ماجور ہوں۔

رمضان المبارک اور اس کے علاوہ مختلف اوقات میں بعض حضرات اساتذہ اور سفراء دارالعلوم کے سلسلہ میں مختلف علاقوں میں تشریف لے جاتے ہیں۔ مقامی طور پر اگر دردمند اہل خیر حضرات دلچسپی سے تعاون فرمائیں تو انشاء اللہ دارالعلوم کی اعانت کا بڑا کام ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین کی حمایت ونصرت کی دولت سے نوازے۔ آمین

(مولانا) ابوالحسن علی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

(مولانا) عبدالسلام قدوائی ندوی
(معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء)

(مولانا) محمد معین اللہ ندوی
(نائب ناظم ندوۃ العلماء)

سید مصباح الدین نقوی
(معتمد مالیات ندوۃ العلماء)